ذکرِ رضوان اللہ

مرتبہ

ڈاکٹر زہرہ خاتون

© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

Zikr-e-Rizwan Ullah

by

Dr. Zohra Khatoon

ISBN: 978-81-944609-0-9

نام کتاب	:	ذکرِ رضوان اللہ
مرتبہ	:	ڈاکٹر زہرہ خاتون
سن اشاعت	:	2023ء
قیمت	:	Rs. 400/-
صفحات	:	192
تعداد	:	300
کمپوزنگ	:	خالد فیصل
ناشر	:	ڈاکٹر زہرہ خاتون
		D-178، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی - 110025
		فون: 9971283786

Publisher:

SK PRINT HOUSE

D-105, A. F. Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025

Mobile: +91 9999828273 | Email: sk.printhouse@gmail.com

ملنے کے پتے

1. Dr. Zohra Khatoon
Department of Persian
Jamia Millia Islamia
Jamia Nagar, New Delhi-25

2. H.No. 20, Zia Lodge
Pul Pehladpur,
New Delhi - 110044
Ph.: 9810906056

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

مرحوم والد محترم کے نام
جن کا وجود اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی
بے بہا نعمتوں میں سے ایک،
جن کی شفقتوں کے زیرِ سایہ میں نے جینے کا سلیقہ سیکھا،
جن کی تربیت نے زندگی کے آداب سکھائے۔

فہرست مضامین

'حصہ اول'

نمبر شمار	عنوانات	مصنف	صفحہ نمبر
1-	تعارف: ذکرِ رضوان اللہ	سہیل انجم	7
2-	پیش گفتار	زہرہ خاتون	14
3-	تاریخ وفات (قطعہ)	پروفیسر سراج اجملی	18
4-	تعزیت نامے		19
5-	رضوان اللہ صاحب کی یاد میں	سہیل انجم	23
6-	رضوان اللہ فاروقی: صحافی، ادیب اور شاعر	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	28
7-	رضوان اللہ فاروقی: ما صدف ہستیم و دردانہ خودیم	نایاب حسن	32
8-	اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا	سید عبید الرحمٰن	49
9-	رضوان اللہ فاروقی اوراقِ مصور کے آئینے میں	حقانی القاسمی	53
10-	اوراقِ ہستی، ایک چشم کشا خودنوشت سوانح حیات	محمد عارف اقبال	60
11-	اردو صحافت کا ایک اور ستارہ ڈوب گیا	عبدالعزیز کلکتہ	71

-12	دہائیوں کا غائبانہ تعارف، چند برسوں کی ملاقات	عبدالسلام عاصم	72
-13	رضوان اللہ فاروقی کے کلام کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر مغیث احمد	75
-14	رضوان اللہ فاروقی کی تبصرہ نگاری	ڈاکٹر شاداب تبسم	107
-15	رضوان اللہ صاحب: کچھ یادیں کچھ باتیں	عبداللہ خالد فیصل	118
-16	رضوان دادا	محمود فاروقی	123
-17	میرے اچھے خالو جان	سیما صدیقی	129
-18	رضوان پھوپھا: میرے معلّم، میرے راہبر	عبدالواسع	132
-19	دادا	مشہود فاروقی	137
-20	میرے ابو	زہرہ خاتون	141

آہنگ فارسی

'حصہ دوم'

عناوین	صفحہ نمبر
سخنی چند	155
التجا	157
ترحم چیست	160
نعت	161
تقدیم	162
خضر و موسیٰ	163
در بیان علم	164
مدحت محبوب	167

کشش و انتشار	169
رفتید ولی نہ از دل ما	170
بہارِ خزاں گزیدہ	171
حکایت صحرانورد	176
محبت چیست	178
جہانِ دو رنگ	180
قطعات	181
متفرقات	186
غنچہ	193
بہ یادِ مادر	198
بیادِ محبِ محترم مولانا ابومسعود اظہر ندوی مرحوم	200

تعارف

ذکرِ رضوان اللہ

سہیل انجم، نئی دہلی

مجھے دہلی میں جن معمر اور بزرگ ہم پیشہ شخصیات کے مشفقانہ سلوک سے محروم ہوجانے کا شدت سے احساس ہے، ان میں رضوان اللہ صاحب سرفہرست ہیں۔ ان کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا تھا جب وہ نئی دہلی میں امریکی سفارت خانے کے انفارمیشن سینٹر میں اردو ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے اور کسی کام سے بہادر شاہ ظفر مارگ پر واقع روز نامہ قومی آواز کے دفتر تشریف لائے تھے۔ میں اس وقت وہاں سب ایڈیٹر تھا۔ اس کے بعد ان سے کب بالمشافہ ملاقات ہوئی مجھے یاد نہیں۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی وہ بڑی اپنائیت سے ملتے اور کافی دیر تک محوِ گفتگو رہے۔ گفتگو کا موضوع عام طور پر صحافت ہی ہوتی اور اس کا محور کلکتہ کے اخباروں میں گزارے ہوئے ان کے شب و روز ہوتے۔ وہاں انھوں نے کس طرح اپنا خون جگر جلا جلا کر صحافت کی شمع کو روشن رکھا یہ بات وہی جان سکتا ہے جو اُن کے اُن پرُ از مصائب ایام سے واقف ہو جو انھوں نے وہاں گزارے یا ان کی صحبت کا فیض یافتہ ہو۔ کلکتہ اور وہاں کی صحافت کا موضوع انھیں بہت مرغوب تھا۔ حالانکہ اس شہر نے انھیں مادی آسائشیں کم

دیں، ہاں تجربات و مشاہدات کا خزانہ وافر دیا۔ اس کے ساتھ قیام کلکتہ کے دوران ہی امریکی سینٹر کے لیے ان کے جز وقتی کام نے انھیں نہ صرف یہ کہ دیگر شہروں سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کے مدیروں اور صحافیوں سے روشناس کرایا بلکہ ان کو ایک شناخت بھی دی۔ لہٰذا جب وہ کلکتہ کو خیر باد کہ کر دہلی آئے اور امریکی سینٹر میں کل وقتی خدمات انجام دینے لگے تو ان کی وہ شناخت جو کلکتہ میں بننی شروع ہوئی تھی، پختہ اور معتبر ہوگئی۔ کہتے ہیں کہ کلکتہ ایک ایسا شہر ہے کہ جو وہاں پہنچا اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔ رضوان اللہ صاحب بھی اس کے عشق میں مبتلا رہے جس کا ثبوت ان کی کتاب ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' ہے۔ لیکن جس طرح محبت میں غم و آلام زیادہ ملتے ہیں اور مسرتیں کم اس طرح رضوان اللہ صاحب نے بھی عشق کلکتہ میں زخم زیادہ پائے، کلفتیں زیادہ اٹھائیں۔

رضوان اللہ صاحب عموماً ادبی و صحافتی تقریبات میں شرکت سے گریز کرتے۔ لہٰذا ان سے میری بیشتر ملاقاتیں یا تو ان کے دولت کدے پر ہوتیں یا پھر ابوالفضل انکلیو کے اس حصے میں جہاں ان کا گھر ہے۔ اسی علاقے میں واقع یونانی سینٹر میں بھی اکثر ان سے ملاقاتیں ہو جاتیں جہاں وہ حکمائے وقت سے مستفیض ہونے کے لیے جاتے تھے۔ ایسی بیشتر ملاقاتیں امریکی سفارت خانے سے ان کی سبکدوشی کے بعد اس وقت ہوئیں جب وہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کے وقیع انگریزی اخبار 'ملی گزٹ' کے لیے مضامین لکھتے رہے اور امریکی سفارت خانے کے اردو جریدے 'اسپین' کے لیے مضامین کے ترجمے کرتے رہے ہیں۔

اسی دوران ایک بار ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں نے ان کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ابوالفضل انکلیو میں واقع آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے دفتر میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ یہ تقریب ان کے تازہ شعری مجموعے 'عکس خیال' کی

مناسبت سے منعقد کی گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے خاکسار کو بھی 'عکس خیال' پر اظہار خیال کا حکم دیا۔ لہٰذا میں نے اس مجموعے پر ایک بھر پور مضمون قلمبند کیا جسے وہاں پیش بھی کیا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے ان کی دیگر کتابوں ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں''، ''بے ادبیات'' اور ''اوراق مصور'' پر بھی اظہار خیال کیا جو مختلف اخبارات میں شائع ہوئے۔ ان کی خود نوشت ''اوراقِ ہستی'' پر بھی اظہار خیال کا ارادہ تھا۔ میں اس دلچسپ اور ضخیم کتاب کا مطالعہ کر ہی رہا تھا اور کتاب کے اوراق تقریباً ختم ہونے ہی والے تھے کہ ان کی کتابِ زندگی کے اوراق ختم ہو گئے۔ لہٰذا ان کی حیات میں اس کتاب پر اظہار رائے کا موقع نہیں مل سکا۔

جب بھی ان کی کوئی نئی کتاب آتی وہ مجھے فون کرتے اور ملنے کی خواہش ظاہر کرتے۔ میں بھی ان سے جلد از جلد ملاقات کی کوشش کرتا۔ وہ بڑی شفقت ومحبت سے اپنی کتاب عنایت کرتے۔ لیکن عام مصنّفین کے برعکس اس پر اظہار رائے کے طلب گار نہیں ہوتے۔ انھوں نے اپنے نام سے ایک ویب سائٹ بھی بنوا رکھی تھی اور اکثر فون کرکے بتاتے کہ میں نے ویب سائٹ پر فلاں چیز پوسٹ کر دی ہے، اس کو دیکھ لیجیے گا۔ مجھے حیرت ہوتی کہ ان جیسا معمر شخص عہدِ جدید کے آئی ٹی انقلاب سے بھی فیض اٹھا رہا ہے۔ حالانکہ یہ نئی نسل کی چیز ہے اور پرانی نسل کے لوگ اس سے اس طرح دوستانہ مراسم قائم نہیں کر پاتے جیسے کہ نئی نسل کر لیتی ہے۔

میری بھی یہ کوشش ہوتی کہ میری کوئی نئی کتاب آئے تو جلد از جلد ان تک پہنچ جائے۔ چونکہ وہ انتہائی کم آمیز تھے لہٰذا آخری دنوں میں ان سے ملاقات کی واحد صورت یہی تھی کہ میں ان کے دولت کدے پر حاضری دیتا۔ اور میں یہی کرتا تھا کہ فون کر کے ان سے وقت لے لیتا اور کتاب لے کر حاضر ہو جاتا۔ جب بھی میں نے فون کیا انھوں نے انتہائی خوشی کا مظاہرہ کیا اور یہی کہا کہ جب جی چاہے آ جائے۔ میں عموماً مغرب کے بعد

حاضر ہوتا اور نصف یا ایک گھنٹہ بیٹھ کر اور ان کی پر لطف باتوں سے محظوظ ہو کر واپس آ جاتا۔ ایک بار پندرہ اگست کے موقع پر میرے ادارے وائس آف امریکہ نے ملک کے بٹوارے پر ایک سیریز چلانے کا فیصلہ کیا اور مجھے حکم دیا کہ میں دہلی میں ایسے لوگوں کے انٹرویو کروں جنھوں نے تقسیم کے خوں چکاں حالات کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہو۔ میں نے رضوان اللہ صاحب کو فون کیا اور انھوں نے وقت دے کر بلالیا۔ ان کا انٹرویو ان کی تصویر کے ساتھ وائس آف امریکہ کی ویب سائٹ پر شائع ہوا جس میں انھوں نے تقسیم ملک کے بعد کلکتہ میں بھڑکے فسادات کا تفصیلی ذکر کیا تھا۔

عام طور پر ایسا ہوتا کہ جب بھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اپنی کوئی نہ کوئی نئی کتاب ان کو پیش کرتا۔ وہ ایک بزلہ سنج اور پر مزاح انسان تھے۔ لہٰذا ایک بار مسکراتے ہوئے کہنے لگے کہ ارے بھائی ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو ہمارے پاس آنے کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے، ایک کتاب لکھنی پڑتی ہے۔ لیکن بہر حال آیا کیجیے اور کوئی ضروری نہیں کہ ہر بار کوئی نئی کتاب لے کر ہی آیئے۔ انھوں نے بہت پہلے اردو صحافت پر شائع ہونے والی کتابوں پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیا تھا جس کا عنوان تھا 'کتب صحافت کی بازدید'۔ اس میں انھوں نے میری چار کتابوں 'بازیافت'، 'میڈیا روپ اور بہروپ'، 'مغربی میڈیا' اور 'اسلام اور میڈیا' اردو اور جدید رجحانات پر بھی اظہار خیال کیا تھا اور لکھا تھا کہ ''میڈیا ایک بحرِ بیکراں ہے جس کی حدیں ہر روز نہیں، ہر لمحہ وسعت پذیر ہیں۔ سہیل انجم اس بحر ناپیدا کنار کے شناور ہی نہیں، ایسے خواص ہیں جو وقفے وقفے سے معلومات کے گہر ہائے آبدار لے کر نمودار ہوتے ہیں۔'' انھوں نے میری کئی دیگر کتابوں پر بھی اپنی قیمتی آرا تحریر فرمائی تھیں جن میں میرا سفر نامہ حج ''بازدید حرم'' اور ''جدید اردو صحافت کا معمار قومی آواز'' قابل ذکر ہیں۔

ان سے میری آخری ملاقات ان کے انتقال سے تقریباً پندرہ روز قبل ہوئی تھی۔

اس وقت گو کہ وہ اپنی تکلیف دہ بیماری سے گزر رہے تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے ہمیں اپنی شفقت و محبت سے محروم نہیں رکھا۔ وہی انداز ملاقات اور وہی انداز گفتار جوان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اس کے بعد میں ان کے نواسے محمد طارق صاحب کو فون کر کے ان کی خیریت معلوم کرتا رہا۔ بالآخر انھوں نے آٹھ اکتوبر 2022 کو وہ خبر دے ہی دی جس کا اندیشہ لاحق تھا۔ ان کے انتقال پر میں نے ایک تعزیتی مضمون لکھا جو روزنامہ انقلاب اور دیگر اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ میں ان کی صاحبزادی ڈاکٹر زہرہ خاتون کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اس مضمون کو اس کتاب میں شامل کیا ہے۔

میں ان کے انتقال کے اگلے روز ہی ڈاکٹر زہرہ خاتون سے اظہار تعزیت کرنا چاہتا تھا لیکن ان کے گھر ان کے لواحقین کی آمد اور وہ غم واندوہ مانع رہے جن سے وہ لوگ گزر رہے تھے۔ اسی وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ رضوان اللہ صاحب نے اپنی پوری زندگی صحافت، ادب اور شاعری کے لیے وقف کر دی تھی لیکن ان کو وہ پذیرائی کبھی نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ لہٰذا کیوں نہ بعد از مرگ ہی سہی ان کی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے ایک کتاب مرتب کی جائے اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا جائے۔ میں نے چند روز کے بعد ڈاکٹر زہرہ خاتون سے ان کے گھر پر ملاقات کے وقت اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے بھی ایسی ہی خواہش ظاہر کی اور کہا کہ وہ بھی چاہتی ہیں کہ ان کے والد صاحب پر کوئی کتاب ترتیب دی جائے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھ سے جو بھی بن پڑے گا میں حاضر ہوں۔

کوئی بھی کتاب تصنیف یا تالیف کرنا آسان نہیں ہوتا۔ خود لکھنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ دوسروں سے لکھوانا۔ اس میں وقت لگتا ہے۔ یہ ایک صبر آزما کام ہے۔ ان کے انتقال کے فوراً بعد کچھ لوگوں نے مضامین لکھے تھے اور چند ان کی زندگی ہی میں تحریر کیے جا چکے تھے بالخصوص ان کی کتابوں پر۔ میں ڈاکٹر زہرہ خاتون کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں

نے کافی مضامین جمع کر لیے۔ انھوں نے اسے ترتیب دے دیا اور اس طرح یہ کتاب بطور خراج عقیدت تیار ہوگئی۔

اس کتاب میں دو قسم کے مضامین ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو دوسروں نے ان کی صحافت، شاعری اور فن پر لکھے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو ان کے اعزا و اقربا نے ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر تحریر کیے ہیں۔ ان میں کئی مضامین تنقیدی نوعیت کے ہیں تو کئی تاثراتی اور کئی عقیدت مندانہ۔ قلم کاروں میں پروفیسر محسن عثمانی، نایاب حسن، حقانی القاسمی، محمد عارف اقبال، عبدالعزیز، عبدالسلام عاصم، ڈاکٹر مغیث احمد (بنارس ہندو یونیورسٹی)، ڈاکٹر شاداب تبسم اور عبداللہ خالد فیصل ہیں۔ نایاب حسن، حقانی القاسمی اور ڈاکٹر مغیث احمد کے مضامین طویل تو ہیں مگر قابل مطالعہ بھی ہیں۔ ڈاکٹر مغیث احمد کا مضمون رضوان اللہ کے فن کا بھر پور احاطہ کرتا ہے۔ اسی طرح ان کے اعزا میں معروف داستان گو محمود فاروقی، سیما صدیقی کراچی، عبدالواسع، مشہود فاروقی اور خود زہرہ خاتون کے مضامین انتہائی گراں قدر ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ کتاب کا یہ دوسرا حصہ جس میں ان کی بیٹی اور دیگر اعزا کی نگارشات شامل ہیں، حاصل کتاب ہے۔ ان مضامین سے رضوان اللہ صاحب کی زندگی کے ان گوشوں پر روشنی پڑتی ہے جن سے دیگر مضامین محروم ہیں۔ ذاتی زندگی کے شب و روز پر عزیز و اقارب جیسی روشنی ڈال سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں ڈال سکتا۔

یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اردو زبان و ادب کی مایہ ناز ہستی یعنی شمس الرحمٰن فاروقی رضوان اللہ صاحب کے عزیز تھے۔ لیکن وہ کبھی بھی اس کا ذکر نہیں کرتے کہ مبادا لوگ یہ سمجھ لیں کہ وہ شمس الرحمٰن فاروقی کی شہرت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اپنے نام کے ساتھ فاروقی بھی نہیں لگاتے تھے کہ اس سے بھی لوگوں کو کچھ شبہ ہوسکتا ہے۔

رضوان اللہ صاحب صرف صحافی ہی نہیں بلکہ بہت اچھے ادیب اور قادر الکلام

شاعر بھی تھے۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ لیکن اپنی شعری نگارشات کو اخبارات یا رسائل و جرائد میں شائع کرانے کے حق میں کبھی نہیں رہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اس فن میں طبع آزمائی محض اپنی خوش طبعی کی وجہ سے اور ذہنی آسودگی کے لیے کیا کرتے تھے۔ زہرہ خاتون نے یہ بہت اچھا کیا کہ ان کا غیر مطبوعہ فارسی کلام بھی کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ یقیناً اس سے بہت سے لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

رضوان اللہ صاحب اولادِ نرینہ سے محروم تھے۔ ان کے اگر کوئی بیٹا ہوتا تو وہ یقیناً میراث پدر کو آگے بڑھاتا۔ ڈاکٹر زہرہ خاتون کی اس کاوش کے پیش نظر میں یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ انھوں نے بیٹی ہو کر وہ کام کیا ہے جو ایک بیٹے کو کرنا چاہیے۔ وہ یقیناً ان کی علمی میراث کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اولاد ہی اپنے بزرگوں کی خدمات سے دنیا کو روشناس کرانے سے گریز کریں تو پھر کون کرائے گا۔ میں ڈاکٹر زہرہ خاتون کو بہت بہت مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

پیش گفتار

اعظم گڑھ دراصل صرف ایک شہر یا ضلع نہیں بلکہ ایک ایسا خطہ ہے، جہاں کے گاؤں اور قصبات کی مٹی ذہانتوں کے لیے بے مثال حد تک زرخیز ہے وہاں کے زائیدہ و پروردہ ذہنوں کی دنیائے ادب پر ضیاء پاشیاں روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ مرحوم رضوان اللہ کا تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا جو ایک کہنہ مشق صحافی، ماہر مترجم، طنز ومزاح نگار اور شاعر جن کی پیدائش اعظم گڑھ کے قصبہ کوئریا پار میں اور تعلیم کانپور میں ہوئی۔ 24 سال کلکتہ (1975-1951) میں بحیثیت صحافی ''آزاد ہند'' اور ''عصرِ جدید'' اخباروں سے وابستہ رہے۔ 1975ء میں دہلی آئے اور امریکی سفارت خانے میں اردو ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنی صحافتی خدمات انجام دیں۔ 1992ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد سے تصنیفات وتراجم کا سلسلہ جاری رہا۔ اردو، فارسی، انگریزی زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ آپ کی تصنیفات میں 'اوراقِ ہستی'، 'شگوفے'، 'عکسِ خیال'، 'ہمارے گاؤں ہمارے لوگ'، 'متاعِ سحر' (شعری مجموعہ اردو)، 'کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'، 'اوراقِ مصور (اردو شعری مجموعہ)، 'بے ادبیات'، 'تبصراتِ کتب' اردو سے انگریزی تراجم میں 'ربا کیا ہے؟'، 'نشیب وفراز'، 'مضامین مقبول'، 'صدائے جرس' اس کے علاوہ انگریزی سے اردو تراجم میں 'کمپیوٹر کورس کی

چار کتابیں' اور 'اردو سیلف ٹاٹ' ہیں۔

اس کے علاوہ ملی گزٹ، اسپین، شب خون، کتاب نما و دیگر اخبارات و جرائد میں بے شمار مضامین شائع ہوتے رہے جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ لکھنے پڑھنے کے شوق نے اس سلسلے کو یونہی رواں دواں رکھا ہوتا اگر چہ خالق حقیقی کا بلاوا نہ آجاتا۔ 8/اکتوبر 2022ء کو یہ عظیم ہستی اس دارِ فانی سے رخصت ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

ان کا کہنا تھا:

ایک رقص دوام ہے دنیا
قصۂ ناتمام ہے دنیا
لوگ آتے ہیں، لوگ جاتے ہیں
اس طرح ناتمام ہے دنیا
وہ جو تسبیح ہے ستاروں کی
اس میں ضامن امام ہے دنیا
جس پہ مرتے ہیں لوگ مرنے تک
چھوڑ جانے کا نام ہے دنیا
بس ازل تا ابد سفر میں میاں
لمحہ بھر کا قیام ہے دنیا

دو روزہ معمولی سی کسالت اور بیماری ان کے جانے کا سبب بن گئی، عزیز واقارب اور دوست، احباب سبھی سوگوار نظر آئے۔ ہر شخص نے ان کے اس دنیا سے رخصت ہونے پر غم واندوہ کا اظہار کیا، بعض لوگوں نے تحریری شکل میں اپنے تاثرات و تعزیت نامے بھیجے۔ بالخصوص محترم سہیل انجم صاحب کی بے حد مشکور وممنون ہوں جنھوں نے تسلی و تشفی بخش کلمات کے ساتھ مجھے قیمتی مشورے دیے، چنانچہ ان کے الفاظ اس

تحریر کی تحریک کا موجب ہوئے۔ یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سہیل صاحب ایک سینئر صحافی ہیں اور وائس آف امریکہ سے وابستہ ہیں۔ صحافت، میڈیا اور ادب کے موضوعات پر ان کی تقریباً دو درجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ نیز قومی و بین الاقوامی متعدد ایوارڈز و اسناد سے نوازے جا چکے ہیں۔ آپ نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود قدم قدم پر رہنمائی فرمائی۔

جناب پروفیسر محسن عثمانی صاحب کی بھی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے رضوان اللہ صاحب (مرحوم) کے فارسی کلام کی جانب میری توجہ مبذول کروائی۔ رضوان صاحب تفریح طبع کے لیے یا یوں کہیے کہ منھ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر اکثر و بیشتر فارسی اشعار، نظمیں، غزلیں، مثنویاں، قطعات وغیرہ کہا کرتے۔ اگرچہ تعداد میں یہ کم ہیں لیکن میری کوشش ہے کہ اس تصنیف کو دو حصوں میں تقسیم کر دوں، پہلا حصہ جس میں عزیز و اقارب و دوست احباب کے تاثرات ہوں اور دوسرا حصہ ان کے فارسی کلام کے لیے مختص ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کوشش میں مجھے کس حد تک کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ محمد خلیل صاحب کی مشکور ہوں، جنھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے مشوروں سے میری ہمت افزائی فرمائی۔ ان تمام افراد کی بے حد احسان مند ہوں جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ والد مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ گھر کے افراد بالخصوص خواھرھای عزیز قمر جبیں، عائشہ، شگفتہ، اور بہنوئی صاحبان جناب قاضی بدر منیر، جناب امتنان احمد صدیقی اور جناب سید جمال احمد کی ممنون ہوں جن کے مفید مشورے میری حوصلہ افزائی کا سبب ہوتے رہے۔ اپنے بھانجے قاضی محمد طارق اور بھانجی شمائل فاطمہ کی تہِ دل سے مشکور و ممنون ہوں، ان لوگوں نے والد مرحوم کی، جب وہ حیات تھے، نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ خدمات انجام دیں اور اب ان بکھرے اوراق کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں بھی پیش پیش رہے ہیں، رفیقِ محترم عارف ضیاء صاحب کی ممنون ہوں، جن کا ساتھ اور نیک خواہشات رکھنا قدم قدم پر مجھے اعتماد بخشتا ہے۔ میرے

بچے اسجد ضیاء و احمد ضیاء کی مشکور ہوں جنھوں نے مختلف مراحل میں میرے کام میں آسانیاں فراہم کیں۔

شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تمام مؤقر اساتذہ و ہمکاران عزیز کی احسان مند ہوں جن کا وجود مجھ میں متحرک رہنے کی تشویق پیدا کرتا ہے۔

آخر میں جناب عبداللہ خالد فیصل صاحب کا شکریہ نہ ادا کروں تو یہ میری ناسپاسی ہوگی، کیونکہ اس تحریر کو عملی جامہ پہنانا ان کی مدد کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے والد صاحب مرحوم کے تئیں اپنے تاثرات کا اظہار بھی کیا ہے آپ نے جو زحمتیں کیں اس کا بے حد شکریہ۔

اس کتاب کی ترتیب و طباعت کے دوران میری ذہنی کیفیت کیا رہی ہوگی، قارئین کو اس کا بخوبی اندازہ ہوگا، لہٰذا درخواست ہے کہ اس کتاب میں ہوئی خامیاں یا فروگزاشت سے صرفِ نظر فرمائیں۔

سپاس گزار

زہرہ خاتون

قطعۂ تاریخ وفات رضوان اللہ فاروقی

۱۱ر ربیع الاول ۱۴۴۴ھ مطابق ۸را کتوبر ۲۰۲۲ء

پروفیسر سراج اجملی، شعبۂ اردو، علی گڑھ

کیسی پیاری ہستی رخصت ہوگئی
جانے والی شخصیت کا ہے غم
یاد آئی ہیں سب کو ان کی باتیں
پڑھ کر آج سہیل انجم کا کالم
اکثر اُن سے ملنے جاتے رہتے
دلی میں صالح عبداللہ اور ہم
شاعر اور صحافی تھے وہ اچھے
قانع گوشہ گیری تا آخر دم
کرتے ہیں افسوس سراؔج اب ان کا
کہتے ہیں اے رب ہو اُن پر کرم
گھر والے ہی کب کرتے ہیں تنہا
'رضوان اللہ فاروقی کا ماتم'

۲۰۲۲ء

تعزیت نامے

رایزنی فرهنگی سفارت جمهوری اسلامی ایران
دهلی نو
OFFICE OF CULTURAL COUNSELLOR
EMBASSY OF ISLAMIC REPUBLIC OF IRAN
NEW DELHI

هوالباقی

انا لله و انا الیه راجعون

سرکار دکترخانم زهره خاتون

استاد بخش زبان و ادبیات فارسی دانشگاه جامعه ملیه اسلامیه ـ دهلی نو

خبر درگذشت پدر بزرگوارتان مرحوم جناب آقای رضوان الله فاروقی که عمر پر برکت خود را در خدمت به رسانه، ادبیات، شعر و ترجمه گذراند موجب تأسف و تأثر عمیق اینجانب و همکاران گردید.

بدینوسیله درگذشت آن مرحوم را به شما استاد ارجمند و خانواده محترم تسلیت عرض نموده و از خداوند سبحان برای آن مرحوم علوّ درجات و برای بازماندگان صبر و شکیبایی مسئلت می‌نمایم.

شریک غم

دکتر محمد علی ربانی
رایزن فرهنگی جمهوری اسلامی ایران
دهلی نو

IRAN CULTURE HOUSE
18, TILAK MARG, NEW DELHI -110001
TEL: 0091-11-23383232 - 34 FAX:+ 23387547
ichdelhi@gmail.com http://newdelhi.icro.ir

محترم رضوان اللہ صاحب کا انتقال ہم جیسے لوگوں کے لیے جتنا کچھ باعثِ افسوس ہے، ظاہر ہے کہ اس سے کہیں زیادہ غم انگیز آپ لوگوں کے لیے ہے اور آپ کے لیے اپنا حال ''نا قابلِ بیان'' ہونا یقیناً قابلِ فہم ہے۔ میں اس غم میں پوری طرح آپ لوگوں کے شریک حال ہوں۔ پورے خاندان کو جس طرح وہ آخر وقت تک شفقت و عاطفت اور فکر مندی و رہنمائی سے نوازتے رہے، نیز آپ سے جو خصوصی تعلق انھیں تھا، مجھے اس کا اندازہ ہے۔ یقیناً یہ غم ایسا نہیں ہوتا کہ گردش روز و شب سے ماند پڑ جائے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ غم ایک عام انسانی تجربہ ہے جسے ہر شخص اور ہر خاندان کو برداشت کرنا پڑتا ہے کیوں کہ حیاتِ انسانی کے خالق نے ہر آنے والے کے لیے واپسی بھی طے کر رکھی ہے۔ اس مرحلہ سے بالآخر ہمیں بھی گزرنا ہے۔ لہٰذا ایک مومن کے لیے اس غم کو انگیز کرنے کا بہترین ذریعہ وہی یاددہانی ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے کرائی ہے یعنی انا اللہ و انا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور خاندان کے سب افراد کو صبرِ جمیل اور قوت و حوصلہ عطا فرمائیں۔ وھو خیر المستعان.

عبدالحیٔ فلاحی

سابق اردو ایڈیٹر، امریکی سفارتخانہ، دہلی

■❖■

دل ڈوب گیا اطلاع پا کر، بے حد تکلیف ہوئی، میرے بزرگوں میں آخری ہاتھ تھا جو ابھی تک سر پر قائم تھا۔ اپنے والد صاحب کے جانے پر جو یتیمی کا احساس ہوا تھا وہ آج اور بڑھ گیا، سمجھ سکتا ہوں آپ لوگوں پر کیا بیت رہی ہوگی۔ دعا کرتا ہوں، خدا کی رحمت آپ کے ساتھ بنی رہے۔ اللہ رب العزت کا نور زمین پر ہم سب کے ساتھ اور آسمان پر رضوان دادا کے ساتھ قائم رہے۔ آمین!

شمس نور الرحمٰن فاروقی، لکھنؤ

■❖■

یوں تو ہماری ان سے ملاقات نہیں تھی مگر ان کی تصنیف سے اندازہ لگا کہ وہ ایک تاریخ ساز، عہد ساز اور کنبہ پرور شخصیت کے مالک تھے۔

یوں تو آئے ہیں دنیا میں سبھی جانے کے لیے
مگر موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس

آسمان تری لحد پر شبنم افشانی کرے

شمس الاسلام عثمانی، گورکھپور

■❖■

رضوان اللہ صاحب کی یاد میں

سہیل انجم، نئی دہلی

ابھی ہم لوگ بزرگ صحافی احمد سعید ملیح آبادی کی رحلت کا سوگ منا ہی رہے تھے کہ ایک اور بزرگ صحافی کے انتقال نے اس سوگ کو دو گنا کر دیا۔ اس صحافی کا نام رضوان اللہ فاروقی ہے۔ احمد سعید صاحب کی عمر تقریباً 96 برس تھی تو رضوان اللہ صاحب کی 91۔ احمد سعید ملیح صاحب کا آبائی وطن ملیح آباد تھا تو رضوان صاحب کا اعظم گڑھ۔ لیکن دونوں کا میدانِ عمل ایک عرصے تک کلکتہ رہا۔ رضوان صاحب نے احمد سعید صاحب کے اخبار روز نامہ ''آزاد ہند'' میں بھی خدمت انجام دی تھی۔ دونوں نے کلکتہ چھوڑ دیا تھا۔ اول الذکر نے اپنے آبائی وطن ملیح آباد کو آباد کیا تو ثانی الذکر نے دہلی کو۔ رضوان صاحب نے 1975 میں کلکتہ سے دہلی ہجرت کی جبکہ احمد سعید صاحب نے ابھی چند سال قبل کلکتہ کو خیر باد کہا۔ رضوان صاحب کے صحافتی کرئیر کا آغاز جولائی 1951 میں کلکتہ کے روز نامہ ''عصر جدید'' سے ہوا اور وہ بھی اس طرح کہ انھیں انگریزی روز نامہ ''اسٹیٹسمین'' کے اداریے کا ترجمہ کرنا تھا۔ ایک ماہ مفت کام کرنے کے بعد اگلے ماہ سے ایک ترجمے کا ایک روپیہ معاوضہ یعنی تیس روپے ماہانہ مقرر ہوا۔ انھوں نے اگلے دس بارہ برس تک ترجمے کا یہ کام کیا۔ لیکن ان کے مطابق اس معاوضے میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ کوئی فرق نہیں پڑا۔

اسٹیٹسمین کے اداریے کا ترجمہ اس لیے کیا جاتا تھا کہ عصر جدید کے مالک اس کے شیدائی تھے لیکن اسے وہ اپنی زبان میں پڑھنا چاہتے تھے۔ رضوان صاحب نے عصر جدید میں اٹھارہ برس کام کیا۔ ترجمے کے علاوہ نیوز ایڈیٹنگ اور رپورٹنگ بھی کی۔ نیوز ایڈیٹنگ کا اعزاز یہ پچاس روپے ماہانہ تھا۔ لیکن کسی معاملے پر وہ مالک کے عتاب کے شکار ہوئے اور جس طرح دوسرے بہت سے صحافیوں کو معمولی معمولی باتوں پر ملازمت سے فارغ کر دیا جاتا تھا، انھیں بھی رخصت کر دیا گیا۔ اس سے قبل احمد سعید صاحب انھیں کئی بار اپنے اخبار میں کام کرنے کی پیشکش کر چکے تھے مگر وہ ہر بار یہ کہہ کر معذرت کرتے رہے کہ میں ایک جگہ کام کر رہا ہوں، بغیر کسی وجہ کے چھوڑنا مناسب نہیں۔ لیکن اب ایک بار پھر احمد سعید صاحب کا تقاضہ بڑھ گیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کو کام کے لیے نہیں بلا رہا، آپ خالی ہیں شام کو آ جایا کیجیے، بیٹھیے، ہم لوگ آپ کی صحبت سے لطف اندوز ہوں گے۔ رضوان اللہ کے مطابق ان کے اس جملے نے ان کو پگھلا دیا اور انھوں نے 1969 میں 'آزاد ہند' جوائن کر لیا۔ وہ وہاں برسوں تک سرد و گرم ماحول میں کام کرتے رہے۔ 'عصر جدید' میں کام کے دوران ہی ان کو کلکتہ میں واقع امریکی سفارت خانہ کے دفتر یو ایس آئی ایس یعنی اس کے انفارمیشن سینٹر میں جز وقتی کام کرنے کا موقع مل گیا تھا جو ایک عرصے تک جاری رہا۔ وہاں بھی ترجمے کا کام تھا اور تنخواہ تین سو روپے ماہانہ تھی۔ اس اضافی آمدنی نے ان کی تنگ دستی کو کسی حد تک کم کر دیا۔ 'آزاد ہند' کے زمانے میں بھی وہ اس کے لیے کام کرتے رہے۔ 1975 میں ان کا سلیکشن دہلی میں واقع امریکی سفارت خانہ کے انفارمیشن سینٹر میں بحیثیت اردو ایڈیٹر ہو گیا۔ اس طرح انھوں نے کلکتہ میں بقول ان کے چوبیس برس پاپڑ بیلنے کے بعد دسمبر 1975 سے یہ نئی ذمہ داری سنبھال لی۔ لیکن اس نئی ذمہ داری کے مستقل ملازمت میں تبدیل ہونے تک انھیں کئی بار ممکنہ اخراج کے پلِ صراط سے گزرنا پڑا۔ قصہ کوتاہ یہ کہ انھوں نے 1992 تک بحسن و خوبی اس ذمہ داری کو نبھایا۔

انھیں کلکتہ میں تو سخت شب وروز سے گزرنا ہی پڑا تھا، دہلی میں بھی برسوں تک مختلف نوعیت کی دشواریوں میں مبتلا رہنا پڑا۔لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے اصولوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ ایک باصلاحیت صحافی، ادیب، شاعر اور مترجم تھے۔ اگر چاہتے تو دولت کی دیوی ان پر مہربان ہو جاتی بس ذرا سا اپنے اصولوں سے چشم پوشی کرنے کی ضرورت تھی۔لیکن انھوں نے پُرآسائش زندگی کے لیے اصولوں کا گلا نہیں گھونٹا۔ انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنا کام دیانتداری کے ساتھ کرنے کو ترجیح دی اور وہ اس پر تا زندگی قائم رہے۔ وہ اردو کے علاوہ انگریزی اور فارسی کے بھی عالم تھے۔ تینوں زبانوں میں شاعری بھی کرتے تھے۔ امریکی سفارت خانے سے سبکدوشی کے بعد جب وہاں سے 2003 میں اردو جریدہ ''اسپین'' نکلنا شروع ہوا تو انھیں بھی انگریزی مضامین کے ترجمے کی ذمہ داری سونپی گئی اور چار سال کے درمیان انھوں نے 272 مضامین کے ترجمے کیے۔ اسی دوران ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کے انگریزی ہفت روزہ ''ملی گزٹ'' میں وہ برسوں تک کالم لکھتے رہے۔ جبکہ اردو اخباروں میں بھی مضامین کا سلسلہ جاری رہا۔ زندگی کے آخری لمحات تک قلم وقرطاس سے ان کا رشتہ قائم رہا۔ 488 صفحات پر مشتمل ان کی خودنوشت ''اوراقِ ہستی'' 2020 میں شائع ہوئی جبکہ 2022ء میں ان کی تصنیف ''تبصراتِ کتب'' منظرِ عام پر آئی جو ان کی آخری تصنیف ثابت ہوئی۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی کتابوں پر دوسروں کے تبصروں اور دوسروں کی کتب پر اپنے تبصروں کو یکجا کر دیا ہے۔ اس میں میری کئی کتابوں پر ان کے اور ان کی کئی کتابوں پر میرے تبصرے بھی شامل ہیں۔ جبکہ ان کی تصنیفات میں ''بے ادبیات''، ''اوراقِ مصور''، ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں''، ''متاعِ سحر''، ''شگوفے''، ''ہمارے گاؤں، ہمارے لوگ'' اور ''عکس خیال'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی میں ان کی چھ کتابیں ہیں۔

ان کا انتقال اردو صحافت و ادب کا ناقابلِ تلافی نقصان تو ہے ہی راقم الحروف کا

ذاتی نقصان بھی ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت وشفقت سے پیش آتے اور جب بھی ملاقات ہوتی انتہائی خوشی کا اظہار کرتے۔ ان سے میری شناسائی کب ہوئی یہ تو یاد نہیں لیکن ان کی محبت وشفقت یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہے گی۔ وہ انتہائی نستعلیق شخص تھے۔ عوامی مجلسوں سے دور رہتے، گوشہ گیری کو غنیمت جانتے۔ خوش اخلاقی، ظرافت و بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور ایمانداری و دیانت داری ان کی پونجی تھی۔ ہم لوگوں نے اوکھلا پریس کلب کے زیرِ اہتمام ان کی خدمات کے اعتراف کا پروگرام بنایا اور ان سے منظوری لینے ہم اور پریس کلب کے ایک دوسرے ذمہ دار معروف کالم نگار ڈاکٹر مظفر حسین غزالی 14 ستمبر کو ان کے دولت کدے پر حاضر ہوئے۔ ان کے سامنے عرضِ مدعا کیا لیکن اپنی شرافت نفسی اور چمک دمک سے دور رہنے کے مزاج کی وجہ سے انھوں نے دست بستہ معذرت کر لی۔ ہم نے ان کی سب سے چھوٹی صاحبزادی اور شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں استاد ڈاکٹر زہرہ فاروقی اور ان کے ایک نواسے محمد طارق کی بھی خدمات حاصل کیں لیکن وہ کسی بھی قیمت پر راضی نہیں ہوئے۔ بالآخر اس تاریخ کے آنے سے قبل ہی وہ دنیا سے چلے گئے۔ ان کے حالات زندگی گواہی دیتے ہیں کہ وہ تاعمر سخت حالات کے شکار رہے۔ تین سال قبل ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا۔ دو سال قبل ان کی پانچ بیٹیوں میں سے چوتھی بیٹی کا، جو کہ اسی محلے یعنی ابوالفضل انکلیو میں رہتی تھی اور ان کی سب سے زیادہ خدمت کرتی تھی اور 2020ء میں ان کے سب سے چھوٹے بھائی پروفیسر فیضان اللہ فاروقی کا انتقال ہوا۔ فیضان اللہ جے این یو کے شعبۂ عربی سے سبکدوش ہوئے تھے۔ ایک بھائی پہلے ہی چل بسے تھے۔ رضوان صاحب اولادِ نرینہ سے محروم تھے۔ ان کے عزیز اور اردو دنیا کی قد آور شخصیت شمس الرحمٰن فاروقی کا دسمبر 2020 میں انتقال ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں سے محمد طارق ان کے مکان میں مع اہل وعیال اقامت پذیر ہیں۔ وہی لوگ ان کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ رضوان صاحب نے کئی بار اپنے اس کرب کا اظہار راقم الحروف سے کیا کہ میں نے زندگی میں بہت دکھ

جھیلے ہیں۔ کلکتہ کے اخباروں میں موم بتی کی طرح جل جل کر اپنی زندگی کی پونجی لٹادی۔ انتقال سے قبل ان کی اہلیہ کی یادداشت چلی گئی تھی تاہم وہ صرف اپنے شوہر کے ہاتھوں ہی کھانا کھاتی تھیں۔ ان کی رحلت کے بعد انھوں نے بارہا کہا کہ سہیل صاحب اب تو میں بالکل تنہا ہو گیا ہوں۔ تنہائی کے عذاب سے نجات پانے کے لیے انھوں نے خود کو لکھنے پڑھنے میں غرق کر دیا تھا۔ ادھر ایک ڈیڑھ ماہ سے مختلف عوارض نے جسمانی ضعف بڑھا دیا تھا۔ اسی شکست وریخت کے عالم میں انھوں نے 8/اکتوبر کو اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے موند لیں۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین!

■❖■

رضوان اللہ فاروقی: صحافی، ادیب اور شاعر

پروفیسر محسن عثمانی ندوی، حیدرآباد

زبان پر قدرت رکھنا ایسی نعمت ہے جو بہت عام نہیں ہے۔ اردو مادری زبان ہونے کے باوجود غالب اکثریت ایسے لوگوں کی ملے گی جو اچھی نثر نہیں لکھ سکتے، وہ ایسی اردو لکھتے ہیں جیسے ہجے کررہے ہوں یا آموختہ دہرا رہے ہوں نہ شیرینی نہ روانی نہ دروبست نہ الفاظ کی نشست و برخواست کا خیال۔ اس قحط الرجال میں ایسا شخص کہاں سے اب ڈھونڈ کر لایا جاسکتا ہے جو تین زبانوں پر یکساں قدرت رکھتا ہو اور تینوں زبانوں میں نثر بھی لکھتا ہو اور شعر بھی کہتا ہو۔ رضوان اللہ فاروقی نادرالوجود انسان تھے جو اچھے انسان ہونے کے ساتھ ساتھ تین زبانوں کے ادیب اور شاعر تھے۔ صرف ادیب ہونا بھی بڑی بات ہے اور صرف شاعر ہونا بھی بڑی بات ہے اور دونوں خصوصیات کو اپنے اندر جمع کر لینا تو بہت بڑی بات ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں نے بچپن میں تھوڑی عربی تھوڑی فارسی سیکھ لی ان کی اردو درست ہو جاتی ہے ورنہ لوگ عذاب 'ز' سے اور سزا 'ذ' سے لکھ دیتے ہیں۔ اچھی اردو لکھنے اور مضمون نگار یا مصنف بننے کے لئے ایک شرط اور ہے اور وہ یہ کہ مطالعہ وسیع ہو اور اہلِ علم کی صحبت بھی اسے نصیب ہوئی ہو، اس کے پاس افکار و خیالات کا خزانہ ہو، اس کے بغیر فکر کی ٹونٹی سے خیال اور فکر کا کوئی قطرہ برآمد نہیں ہوسکتا

ہے اور نہ صریر خامہ نوائے سروش بن سکتا ہے۔ رضوان اللہ فاروقی صاحب کی زندگی صحافت کے کوچہ میں گذری، بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو صحافت کے سراب میں چشمہ آب تک پہنچ جاتے ہیں، زبان کے ریگ زار میں شعر و دب کے لالہ زار تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی لئے میں نے کہا کہ جناب رضوان اللہ فاروقی غیر معمولی انسان تھے جو روز روز نہیں پیدا ہوتے ہیں ان کی وفات ادب کی دنیا کا بڑا حادثہ ہے۔

رضوان اللہ فاروقی صاحب سے جب بھی ملاقات ہوتی اپنی کوئی نئی کتاب تحفہ میں ضرور دیتے چونکہ وہ شعر و ادب کی دنیا کے آدمی تھے اس لئے جب میری کتاب ''مشاہیر ادبیات مشرقی'' قومی کونسل سے شائع ہوئی تو میں نے ان کی خدمت میں پیش کی، انہوں نے کئی بار ٹیلیفون کیا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ان کے حالاتِ زندگی ان کی ضخیم خودنوشت ''اوراقِ ہستی'' سے آسانی سے معلوم ہو سکتے ہیں، جس میں کلکتہ کا ذکر بہت ہے کیونکہ وہیں ان کی جوانی گذری اور وہیں لیلائے صحافت سے آشنائی ہوئی اور پھر صحافت سے تا عمر وابستہ رہے اور دہلی آنے کے بعد انگریزی صحافت سے بھی۔ وہ خود تو جوان نہیں رہے لیکن ان کا قلم ہمیشہ جوان رہا اور اپنی جولانی دکھاتا رہا۔ جب وہ فارسی میں شعر کہتے تو ایسا لگتا عندلیب سخن بزبان شیراز نغمہ سرا ہے یا ہندوستان میں کسی حافظ شیرازی کا قدوم میمنت لزوم ہو گیا ہے۔ لیکن ہندوستان میں شعر العجم کے قدرداں اب کہاں ہیں لوگوں کو فارسی نہیں آتی۔ رضوان اللہ فاروقی ایک شریف اور پاکباز انسان تھے جتنی رنگینیاں تھیں جن سے وہ محظوظ ہوتے تھے وہ شعروادب کی وادی کی رنگینیاں تھیں۔ بچپن میں ان کا ساتھ رہا، غالباً شعروادب کا ذوق اسی طرح ان کے اندر منتقل ہوا اور پھر کلکتہ کی ادبی محفلوں نے اس ذوق کو پروان چڑھایا۔

رضوان اللہ فاروقی صحافی تھے زیادہ تر صحافی صرف معمولی نثر نگار ہو کر رہ جاتے ہیں، ایسے نثر نگار جو سپاٹ نثر لکھتے ہیں اور اکھڑی اکھڑی زبان، ان کی زبان لڑکھڑاتی ہے

تو تلاتی ہے، فکر انگیز اچھی نثر لکھنے والے صحافی کم ہوتے ہیں۔ رضوان اللہ فاروقی کی صحافت میں ادیب اور شاعر چھپا ہوا ہے، وہ صحافی بھی ہیں، طنز نگار بھی ہیں، شاعر بھی ہیں۔ ان کی کتاب ''اوراقِ مصور'' مثنوی ہے اور انہوں نے مثنوی کا اسلوب اس لئے اختیار کیا کہ کلکتہ کی تاریخ لکھنے کے لئے یہی فارم موزوں تھا اس کتاب کی اسکرین پر پورا کلکتہ نظر آتا ہے رواں دواں، افتاں و خیزاں، ایک ہجوم کا رواں کہیں بہار کہیں خزاں کہیں خبر نویسوں کی گفتگو کہیں شاعروں کے درمیاں رضوان اللہ فاروقی کی مزاح نگاری کا فن ''بے ادبیات'' میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ کتاب کا نام بھی ادبی حلقوں میں اپنی انفرادیت رکھتا ہے اور یہ انفرادیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ادیب میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ طنز و مزاح کا فن بڑا عجیب فن ہے، فنکار کو بڑی چابک دستی سے سماج کی برائیوں کو قاری کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے۔ ''بے ادبیات'' کے مضامین پطرس بخاری، انجم مانپوری وغیرہ کی یاد دلاتے ہیں۔ رضوان اللہ فاروقی کی ادبی کاوشوں میں ان کی کتاب ''ہمارے گاؤں، اور ہمارے لوگ'' کا بھی شمار ہے۔ دہلی اور کلکتہ میں عمر گزارنے کے باوجود اپنے بچپن اور دیہات کی سوندھی مٹی کو وہ بھول نہیں سکے، ایک شاعر کو گلیاں یاد آتی تھیں ؎

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی تھی
زباں پر جب کسی کے ذکر گورکھپور آتا ہے

رضوان اللہ فاروقی کو اپنا دیہات یاد آتا تھا یعنی وہ دیہات جس کو پریم چند بھی فراموش نہیں کر سکے۔ رضوان اللہ فاروقی کا دیہات اعظم گڑھ کے قرب و جوار میں تھا۔ وہ اعظم گڑھ جس کے بارے میں کسی شاعر نے کہا تھا جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر اعظم ہوتا ہے، وہ دیہات جہاں زندگی بہت سادہ ہوتی ہے، جہاں کے لوگ بہت سادہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے گاؤں کی اور گاؤں کے لوگوں کی منظر نگاری بہت اچھی کی ہے۔ ان کی کتاب ''عکس خیال'' ان کی نظموں کا مجموعہ ہے اور اپنے ہی اشعار کو انہوں نے انگریزی کا

قالب بھی بخشا ہے اور اسی کتاب کا انگریزی نام My Reflection رکھا ہے۔ دونوں زبانوں پر ان کی دسترس کا اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے کئی کتابوں کے انگریزی میں ترجمے کئے۔ دہلی سے 'ملی گزٹ' کے نام سے جو انگریزی ہفت روزہ ڈاکٹر ظفرالاسلام خان نے نکالا تھا، رضوان اللہ فاروقی صاحب اس کے مستقل کالم نگار تھے۔ انہوں نے کئی کتابوں کے انگریزی میں ترجمے کئے۔ انگریزی میں شاعری بھی کی۔ اردو میں بھی ان کی منظومات موجود ہیں، فارسی میں بھی ان کی طویل نظمیں ہیں جو شائع ہو چکی ہیں۔ اب ایسے لوگ کہاں ملیں کہ جو تین زبانوں پر مکمل دسترس رکھتے ہوں اور تینوں زبانوں میں شعر بھی کہہ سکتے ہوں اور نثر بھی لکھ سکتے ہوں۔ اب رضوان اللہ فاروقی جیسے لوگ نہیں پیدا ہو سکتے ہیں کیونکہ اس صلاحیت اور استعداد کی نشو ونما کے لئے کتابوں سے تعلق بہت ضروری ہے۔ اب کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے اور موبائل ہاتھ میں آ گیا ہے۔ اب رضوان اللہ فاروقی کو الوداع کہئے اور ان صلاحیتوں کو بھی جن کی وہ نمائندگی کرتے تھے۔

■❖■

رضوان اللہ فاروقی

ما صدف ہستیم و دردانہ خودیم!

نایاب حسن، دہلی

اردو کے بزرگ صحافی، ادیب و شاعر، سیلف میڈ شخصیت اور متعدد کتابوں کے مصنف و مترجم رضوان اللہ فاروقی 8/اکتوبر 2022 کی صبح انتقال کر گئے۔ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا (نئی دہلی) میں ان کی رہائش تھی۔ ان کی عمر تقریباً بانوے سال تھی۔ مرحوم کا اصل وطنی تعلق اعظم گڑھ کے کوئریا پار سے تھا، مگر چالیس سال کا عرصہ ہوا کہ وہ دلی میں مقیم تھے۔ بٹلہ ہاؤس، ذاکر نگر، شاہین باغ و ابوالفضل انکلیوان کی آنکھوں کے سامنے آباد ہوئے۔ وہ 78-1977 میں اس علاقے میں آکر رہائش پذیر ہوئے تھے۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے خاصے گوشہ گیر، خلوت گزیں اور اپنے کام سے کام رکھنے والے انسان تھے؛ اس لیے کم وبیش ستر سال تک سرگرم صحافتی اور ادبی وتخلیقی سرگرمیوں کے باوجود عوامی، علمی وادبی حلقوں پر وہ اس طرح نہیں چھا سکے، جس طرح بعض کوتاہ قد، کوتاہ علم، کوتاہ فہم، مگر تشہیری حربوں سے آگاہ لوگ چھائے رہتے ہیں۔ اپنی شخصیت کا پروپیگنڈہ اور تفخیمِ ذات ایک مستقل فن ہے، جس میں عموماً جینوئن عالموں، ادیبوں اور تخلیق کاروں کا ہاتھ خاصا

تنگ ہوتا ہے اور یہ 'کمی' رضوان اللہ صاحب میں بھی پائی جاتی تھی۔

ان سے ہمارا تعارف مختلف اخبارات میں شائع ہونے والے ان کے مضامین کے ذریعے کئی سال قبل ہوا، مگر چند ماہ قبل ان کی خودنوشت 'اوراقِ ہستی' پڑھنے کا موقع ملا، تو ان کی شخصیت اور زندگی کے کئی پہلوؤں سے خوشگوار وحیرت انگیز آشنائی ہوئی۔ اس عمر میں بھی ان کا ذہن وقلم ایکٹیو تھے اور 488 صفحات پر مشتمل مذکورہ خودنوشت 2020 میں شائع ہوئی، جبکہ تبصروں کا ایک مجموعہ تو ابھی ایک ماہ پہلے انھوں نے شائع کروایا تھا۔

اس کتاب کو انھوں نے چار اوراق میں تقسیم کیا ہے اور ہر ورق کے ذیل میں اپنی زندگی کے ایک حصے کا احوال بیان کیا ہے۔ 'پہلا ورق' ابتدائی حالات، خانگی کوائف، ددیہالی ونھیالی خاندان کی تفصیلات، تعلیمی سلسلوں، جونپور و کانپور کے قیام، بنارس و دیوریا کی ملازمتوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

'دوسرا اورق' ان کی صحافتی زندگی کو بیان کرتا ہے، جس کا باقاعدہ آغاز کلکتہ کے 'عصر جدید' سے 1951 میں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ 'آزاد ہند' اور دیگر اخباروں میں بھی وہ ایڈیٹنگ اور ترجمہ نگاری کا کام کرتے رہے۔ یہ حصہ 153 سے 282 صفحات تک پھیلا ہوا ہے اور اس میں 1951ء سے 1975ء تک کی نہ صرف اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے نشیب وفراز کی داستان انھوں نے لکھی ہے، بلکہ اس کے بین السطور میں وہاں کی پچیس سالہ اردو صحافت کی پوری تاریخ سمٹ آئی ہے۔ جن اخباروں (خصوصاً عصر جدید اور آزاد ہند) میں انھوں نے کام کیے، وہاں کے اندرونی حالات، ان کے مالکان اور ملازموں کی کشمکش، اخباری دفاتر کے اندر اور باہر چلنے والی بوگس سیاستوں، وہاں کام کرنے والے مختلف اشخاص کا احوال اور ان اخباروں میں شائع ہونے والے مواد پر اجمالی تبصرے کے ساتھ اس دوران ذاتی زندگی میں رونما ہونے والے انقلابات کا بھی اس حصے میں ذکر کیا ہے۔ اسی طرح آزادی کے فوراً بعد اردو صحافت کو جس قیامت خیز صورتِ حال کا سامنا تھا اور

اردو کے صحافی جس کسمپرسی سے گزر رہے تھے، اس کا بھی مجموعی جائزہ لیا ہے۔

کلکتہ میں قیام کے دوران ہی انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے جرنلزم میں پوسٹ گریجویشن کیا، گریجویشن وہ کرائسٹ چرچ کالج کانپور سے کر چکے تھے۔ 1957 میں عصر جدید کے منیجر اشتہارات بھارتی جی کی معرفت ان کی رسائی امریکی دفتر اطلاعات تک ہوئی اور پھر ایک معقول ملازمت کی راہ نکل آئی۔ 1975ء تک تو اس کے لیے جز وقتی اردو ترجمہ وایڈیٹنگ کا کام کرتے رہے، پھر اسی سال انھیں اس کے دہلی دفتر میں شعبہ اردو کا ذمے دار بنا کر بھیجا گیا۔ اپنی سوانح کے 'تیسرے ورق' میں ملازمت کے اس دور کا انھوں نے احاطہ کیا ہے، جو 1992ء تک دراز ہے۔ اس دوران انھیں جن ذاتی واقعات و سانحات سے گزرنا پڑا، پیشہ ورانہ مصروفیتوں کے ذیل میں ملک اور ملک سے باہر جو اسفار کیے اور کس طرح مختلف چیلنجز کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیتے رہے، ان سب کا احوال اس حصے میں ہے۔ جبکہ 'چوتھا ورق' انھوں نے اسفار کی روداد کے لیے خاص کیا ہے اس میں خود ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ افغانستان، پاکستان، برطانیہ و امریکہ وغیرہ کے سفرنامے انھوں نے تحریر کیے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے مجھے معلوم ہوا کہ پروفیسر فیضان اللہ فاروقی پانچ بھائیوں میں ان کے سب سے چھوٹے بھائی تھے، جن کا 2020ء میں انتقال ہوا ہے، وہ جے این یو کے شعبۂ عربی سے ریٹائرڈ اور قدیم فاضل دیوبند تھے۔ اسی طرح ابتدائی حصے میں جو خاندان کا احوال انھوں نے بیان کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اردو کے معروف دانشور اور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کا تعلق بھی انھی کے خاندان سے تھا۔ وہ رشتے میں رضوان اللہ صاحب کے بھتیجے تھے، ان کے چچازاد بھائی خلیل الرحمٰن صاحب کے بیٹے تھے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دادا مولوی اصغر گورکھپور گورنمنٹ اسکول میں اردو فارسی پڑھاتے تھے اور فراق گورکھپوری کے بچپن کے استاذ تھے۔ اس حصے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا

خاندان کافی بھراپرا تھا اور بیشتر لوگ مختلف علوم وفنون سے آراستہ اور صاحبانِ وقار واعتبار تھے۔ مجموعی طور پر ان کا خاندان مشرقی یوپی کے زمیندار خاندانوں میں سے ایک تھا، مگر اس کی زمینداری مرورِ زمانہ اور صاحبانِ حق کی کثرت کی وجہ سے بہ تدریج سمٹتی، سکڑتی گئی اور بالآخر آزادی کے بعد اس کا کلی خاتمہ ہوگیا، جس کی وجہ سے ان کے خاندان کے دوسرے نوجوانوں کی طرح خود رضوان اللہ صاحب کو بھی اپنی تعلیمی وعملی زندگی میں بے شمار دشواریوں سے دو چار ہونا پڑا اور انھیں ایسی آسودگی کبھی حاصل نہ رہی، جو انسان کو حقیقی معنوں میں احساسِ عیش سے ہمکنار کرتی اور غم روزگار سے مستغنی کر دیتی ہے، لیکن حالات کی تنگی وترشی کے باوجود انھوں نے کبھی ناشکری کا دامن نہیں تھاما، ہمیشہ با حوصلہ رہے، صابر وشاکر رہے، ان کی امنگوں، ترنگوں اور تازہ دمی وشادابی میں تاحیات کوئی کمی نہیں آئی اور سینہ سپر ہو کر ہر قسم کے سانحے کا مقابلہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تاحیات دینی ونفسیاتی اعتبار سے توانا رہے، ان کی غیر معمولی صلاحیتیں علم وقلم کی مختلف راہوں کو اجالتی رہیں اور انھوں نے زبان وادب کے کئی گوشوں کو اپنے نتائج فکر تخلیق سے منور کیا۔

اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ رضوان اللہ صاحب نے اس میں زمانی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے سلسلہ وار اپنا زندگی نامہ تحریر کیا ہے۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ چوں کہ وہ ایک دیدہ ور صحافی ہیں اور اخباری صحافت کے علاوہ سفارتی صحافت سے بھی ان کا گہرا رشتہ رہا ہے؛ اس لیے وہ اپنے حالات کے ساتھ مختلف زمانی وقفوں میں رونما ہونے والے قومی و عالمی سانحات و واقعات کا تذکرہ و تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ ایک حسن اس کتاب کا زبان و بیان کی سلاست، شیرینی اور غیر معمولی روانی بھی ہے، چوں کہ رضوان اللہ صاحب محض روایتی قسم کے صحافی نہیں تھے، انھیں اردو کے علاوہ فارسی و انگریزی زبانوں پر بھی کامل عبور تھا اور ادبی وشعری ذوق بھی بڑا زرخیز تھا؛ اس لیے ان کی اس کتاب میں معلومات، تجزیوں اور مختلف سیاسی و سماجی حالات پر چشم کشا تبصروں کے

علاوہ اسلوب و ادا کی رعنائی و زیبائی بھی بخوبی پائی جاتی ہے۔ پڑھتے ہوئے کہیں طبیعت کو اضمحلال، بوریت یا تکان کا احساس نہیں ہوتا۔

اس خودنوشت کے علاوہ ان کا ایک شعری مجموعہ 'متاعِ سحر' (2008ء) ہے، جس میں اردو نظموں، غزلوں کے علاوہ ان کا فارسی کلام بھی شامل ہے۔ 'اوراقِ مصور' (2002ء) ان کی ایک طویل مثنوی اور دو نظموں کا مجموعہ ہے۔ 'عکسِ خیال' ذولسانی (اردو و انگریزی) نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔

رضوان اللہ صاحب کی شاعری بڑی جاندار و طرحدار ہے، ان کی غیر معمولی مشاہداتی قوت اور زبان آوری اس سلسلے میں خصوصاً ان کے ہم رکاب رہی ہے؛ چنانچہ ان کی نظموں اور غزلوں میں معنی آفرینی بھی ہے اور ان کی لفظیاتی سطح بھی بڑی ہموار، خوش رنگ اور دل آگیں ہے۔ انھوں نے اپنے طویل سفرِ حیات میں ذاتی زندگی کی اتھل پتھل کے علاوہ ملک اور دنیا کے بے پناہ تغیرات و سانحات دیکھے اور ایک سرگرم صحافی ہونے کی وجہ سے ایسے کئی سانحات کے وہ چشم دید گواہ بھی رہے؛ اس لیے ان کی شاعری، خصوصاً نظمیہ شاعری میں زمینی حقائق و احوال کی عکاسی محض شاعرانہ خیال آرائی پر مبنی نہیں ہے؛ بلکہ وہ اپنے واقعاتی پس منظر کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ حال ان کی غزلوں کا بھی ہے، البتہ ان میں رومانیت اور حسن و عشق، ہجر و فراق جیسے روایتی موضوعات کو بھی انھوں نے برتا ہے، مگر ظاہری ساخت اور تخیل کے حوالے سے اپنا انفراد بھی انھوں نے قائم رکھا ہے، چند اشعار، جن میں انسانی زندگی کے کئی رنگ جھلملاتے نظر آتے ہیں:

وہ جہان بھی کیا جہان تھا، جہاں رات میری گزر گئی
وہ ہوائے شوق تھی مشک بو رگِ جاں کو جیسے کتر گئی
کوئی رشکِ حسنِ تمام تھا، وہی قد و قامتِ سروسا
وہی برق جس کا بیاں ہو کیا، جو گری تو دل میں اتر گئی

دل کہاں ہر کسی سے ملتا ہے
یہ تو بس آپ ہی سے ملتا ہے
تکتا رہتا ہوں دیر تک اس کو
چہرہ جس کا کسی سے ملتا ہے
لے کے جائے جہاں جہاں بھی مجبوری
کون کس سے خوشی سے ملتا ہے

نہ دکھا سکا تجھے داغِ دل، نہ سمجھ کہ بجھ گئے سب دیے
یہ لحاظ مجھ کو ضرور ہے، نہ ہو داستاں یہ زباں زباں
جو کہا کسی نے وہ آ رہا ہے کوئی فریفتہ آپ کا
تو نگاہ ناز اٹھی ذرا، کہا اِک ادا سے: کہاں؟ کہاں؟

سنو سنو کہ جوانی رہے رہے نہ رہے
گھڑی گھڑی ہے سہانی، رہے رہے نہ رہے
چلو چلو کہ تماشاے زندگی دیکھیں
یہ رنگ روپ ہے فانی رہے رہے نہ رہے

نظمیں انھوں نے پابند بھی کہی ہیں اور معریٰ بھی اور دونوں قسم کی نظمیں اپنی ہیئت کے اعتبار سے بڑی توانا اور مقصدیت سے معمور ہیں۔ ان کے موضوعات زیادہ تر سماجی مسائل کا احاطہ کرتے ہیں یا فرد کے احوال کی تخلیقی وتخیلاتی منظر کشی کرتے ہیں۔ خود اپنے آپ کو موضوع بنا کر جو نظمیں انھوں نے کہی ہیں، وہ بھی اپنے پیغام یا مجموعی فضا کے اعتبار سے عمومی معنی لیے ہوئی ہیں۔ 'نئے آدم کی تشکیل'، 'اکیلی کتاب'، 'تلاش'، 'درد کی

لذت باقی ہے'، ' روٹی'، ' سیل' اور 'سفر جاری ہے' ان کی بہت خوب صورت، معنی خیز اور انسانی المیوں کو واشگاف کرنے والی بڑی پر شوکت نظمیں ہیں۔

انھوں نے میرؔ و غالبؔ کی غزلوں پر تضمینیں بھی بہت شان دار کی ہیں، مثلاً میرؔ کی ایک غزل پر تضمین کا پہلا بند ملاحظہ کیجیے:

دنیا سے بے خبر تھا عجب اضطراب تھا
گویا جہاں کو آنکھ کا پردہ حجاب تھا
پہلو میں ایک دل تھا سو خانہ خراب تھا
'دل میں بھر از بسکہ خیال شراب تھا
مانند آئینے کے مرے گھر میں آب تھا'

غالبؔ کی ایک مشہور غزل پر بھی انھوں نے بہت اچھی تضمین کی ہے، ایک بند:

ہتھیلی پر انا لے کر جو محتاجِ کرم نکلے
قیامت سے گزرنا تھا جو گم نامی سے ہم نکلے
تمناؤں کے پھندے میں زبوں، صید الم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اس کے علاوہ مثنوی، رباعی اور قطعہ نگاری میں بھی رضوان اللہ صاحب نے طبع آزمائی کی ہے اور اپنی تخلیقی جولانی کے عمدہ نقوش پیش کیے ہیں۔

وہ فارسی سخن طرازی میں بھی غیر معمولی دسترس رکھتے تھے اور باقاعدہ اس زبان میں غزلیں، نظمیں اور رباعی وغیرہ کہی ہیں۔ ان کی فارسی شاعری میں بھی تخیل کی بلند پروازی اور لفظیات کی شیرینی سحر انگیزی مرتبہ کمال کو پہنچی ہوئی ہے، اسے پڑھتے ہوئے ہمیں اردو کے ساتھ فارسی زبان اور اس کے شعری در و بست پر ان کی حیرت انگیز گرفت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ فارسی شاعری کی پوری روایت، جو منوچہری و رودکی،

فردوسی و عمر خیام، فریدالدین عطار وسنائی، سعدی و حافظ شیراز، شمس تبریزی و مولانا روم اور امیر خسرو و اقبال وغیرہ سے وابستہ ہے، ان کے پیشِ نظر ہے اور اسی روایت کو وہ اپنے شوخ وشیریں و دلکش انداز میں آگے بڑھا رہے ہیں۔ بڑے رواں، سلیس اور شگفتہ الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور خاصے دل آویز پیرایے میں اپنے افکار کو اشعار کے پیکر میں ڈھالتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اے تیرگی وداع کہ پیروزیِ سحر
بر کف نہادہ طالعِ بیدار آمدیم
بر خیز! دست آر! کہ بنیانِ نونہیم
نے ما برائے شورش و پیکار آمدیم

(اے تیرگی رخصت ہوجا کہ صبح دم ہم اپنی ہتھیلی پر بختِ بیدار لے کر آئے ہیں۔ اٹھو، اپنا ہاتھ بڑھاؤ کہ مل کر ہم بنیادِ نو اٹھائیں، ہم محض ہنگامہ معرکہ آرائی کے لیے نہیں آئے)۔

چون نہ بینی دردِ پنہاں چشم و دامانم نگر
داغہا در سینہ دارم، زخمِ عریانم نگر
قصہ ما مشعلے روشن کند راہِ صواب
شعلہ سامانم ولے گلہا بدامانم نگر

(اگر تمھیں میرا دردِ پنہاں نظر نہیں آرہا تو میرے چشم و دامن کو دیکھو، میرے سینے میں بے شمار داغ ہیں، (تم) میرے اس زخم (کو ہی دیکھ لو) جو ظاہر ہے۔ ہمارا قصہ یہ ہے کہ ہم اس مشعل کے مانند ہیں، جو راہِ راست کو روشن کرتی ہے، ہم خود تو شعلہ ساماں میں گھرا اپنے دامن میں پھول رکھتے ہیں، دیکھو!)

سحر دمید بیابام و در کشادہ کنیم

بیا کہ قصہ فصلِ بہار تازہ کنیم
بیا کہ خوشہ دل جامِ ارغواں پر کرد
بیا بیا کہ بہم باز شغلِ بادہ کنیم

(صبح ہو چکی، آؤ کہ بام و در کھولیں، آؤ کہ موسم بہار کے قصے کو تازہ کریں۔ آؤ کہ خوشہ دل نے جامِ ارغواں کو بھر دیا ہے، آؤ آؤ کہ ہم پھر شغلِ بادہ نوشی کریں)

مضمون کے عنوان میں جو فارسی مصرعہ میں نے استعمال کیا ہے، وہ رضوان اللہ صاحب ہی کی رباعی کا ہے، مکمل رباعی یوں ہے:

ما چراغ ہستیم و پروانہ خودیم
طرفہ خود آگاہ و دیوانہ خودیم
ما صدف ہستیم و دردانہ خودیم

(ہمیں چراغ ہیں اور ہمیں پروانہ ہیں، عجب یہ ہے کہ ہم خود آگاہ بھی ہیں اور ہم پر دیوانگی بھی طاری ہے، ہم اپنی آبروے درد کے محافظ ہیں، ہمیں صدف ہیں اور ہمیں موتی ہیں)

نثر میں ان کی ایک کتاب 'کلکتہ کی اردو صحافت اور میں' ہے، جس میں کلکتہ کی اپنی صحافتی سرگرمیوں اور وہاں کی مجموعی اردو صحافت کے اور چھور پر تفصیل سے لکھا ہے۔ 'ہمارے گاؤں ہمارے لوگ' میں اپنے گاؤں اور وہاں کے بعض مخصوص لوگوں کا خاکہ کھینچا ہے۔ 'بے ادبیات' ان کی ایک دلچسپ کتاب ہے، جس میں طنزیہ مزاحیہ مضامین اور منظومات جمع ہیں، ابھی وفات سے پہلے ایک ماہ قبل ان کی ایک کتاب 'تبصرات کتب' شائع ہوئی تھی، جس میں انھوں نے ایک منفرد تجربہ کیا ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں خود اپنی کتابوں پر مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے تبصروں کو شامل کیا ہے، جن کی تعداد سولہ ہے اور دوسرے حصے میں دوسرے مصنفین کی کتابوں پر اپنے تبصرے شامل کیے

ہیں اور ان کی تعداد ستائیس اٹھائیس ہے۔

لکھنے کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری بھی رضوان اللہ صاحب کا کل وقتی مشغلہ تھا؛ اس لیے انھوں نے پیشہ ورانہ تراجم کے علاوہ خود اپنی بہت سی تحریروں کے انگریزی ترجمے کیے اور دوسرے مصنّفین کی متعدد کتابوں کے ترجمے بھی ان کے قلم سے منظر عام پر آئے، ان میں سے ایک اقبال سہیل کی مشہور کتاب 'ربا کیا ہے؟' کا انگریزی ترجمہ What is Reba? اور ابوالفضل انکلیو کے بانی ابوالفضل فاروقی کی خودنوشت سوانح 'نشیب وفراز' کا انگریزی ترجمہ Ups and Downs خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ پروفیسر مقبول احمد کی متعدد تصانیف اور مختلف نصابی کتابوں کے اردو سے انگریزی ترجمے کیے۔

الغرض رضوان اللہ صاحب کی شخصیت بڑی ذوجہات تھی، زندگی انھوں نے بڑی بھرپور، بافیض اور ماجرا پرور گزاری۔ اردو صحافت کا وقار بن کر رہے اور اپنے پیچھے منثور و منظوم تخلیقات وتراجم کا قابلِ قدر ذخیرہ چھوڑ گئے۔ ان کی بعض تصانیف مکتبہ جامعہ سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ rizwanullah.com کے نام سے ان کی پرسنل ویب سائٹ بھی ہے، جو انھوں نے 2015ء میں بنوائی تھی۔ وہاں ان کی منتخب تحریریں اور پی ڈی ایف ورژن میں ان کی کتابیں بھی مل جائیں گی۔

بے ادبیات

طنز ومزاح کے لطیف اور باریک پیرائے میں سماجی مسائل کی تصویرکشی کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ عام لوگ نہیں لگا سکتے۔ اپنے عہد کی برائیوں اور خامیوں کو اجاگر کرنے کا فن خدا داد ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑے دل گردے کی بات ہوتی ہے کہ اپنے اوپر ہنس کر لوگوں کو ہنسنے کا موقع فراہم کیا جائے اور یہ بہت بڑا فن ہے کہ اس ''خود ہنسائی'' کی آڑ میں سماج کو آئینہ دکھایا جائے، آج کے اس دور میں جبکہ ہر چیز نقلی ملتی ہے اور جینئنٹی کا قحط ہے اگر کہیں سچی تحریریں پڑھنے کو مل جائیں تو ذہن ودماغ کو بڑی مسرت ہوتی ہے۔

حالانکہ آج بھی بہت سے اخبارات ورسائل میں طنزیہ تحریریں دیکھنے کومل جاتی ہیں لیکن ان میں بہت کم ایسی ہوتی ہیں جو اوریجنل ہوں۔ بیشتر تحریریں پیش رو مزاح نگاروں کے مضامین کا سرقہ ہوتی ہیں۔ کہیں موضوع کا سرقہ کہیں لب و لہجے کا اور کہیں انداز بیان کا۔ اس کے علاوہ ان تحریروں میں صاف ستھرا مزاح بھی تقریباً ناپید ہوتا ہے۔ تاہم بعض مزاح نگار ایسے ضرور ہیں جن کی تحریروں میں ستھرا ذوق نظر آتا ہے۔ ورنہ طنز ومزاح کے نام پر زیادہ تر ایسی چیزیں قارئین کے دسترخوان پر پروسی جاتی ہیں جن میں بھانڈپن زیادہ ہوتا ہے۔

ابھی حال ہی میں معروف صحافی، شاعر اور مزاح نگار، رضوان اللہ کے مجموعہ 'بے ادبیات' کو پڑھنے کا موقع ملا۔ اس میں دو حصے ہیں۔ ایک نثر اور دوسرا نظم کا۔ نثری حصے کو انھوں نے 'بےادبیاں' کا نام دیا ہے اور منظوم حصے کو انھوں نے 'بدنظمیاں' کہا ہے۔ اور ان دونوں کے مجموعے کو 'بےادبیات' قرار دیا ہے۔ مجموعہ کے نام سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ رضوان اللہ کو اپنے اوپر ہنسنے میں کوئی عار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تصنیفات کو 'ناتجربہ کاریاں' قرار دیا ہے۔ اپنے آپ کو اس قدر مذاق کا موضوع بنانا اور خود کو حقیر فقیر بنا کر پیش کرنا سب کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ وہی کرسکتا ہے جو اعلیٰ ظرف کا مالک ہو اور جو یہ جانتا ہو کہ 'خود ہنسائی' کی آڑ میں لوگوں کو آئینہ دکھانا کتنا مؤثر اور کارگر ہتھیار ہے۔

اس پورے مجموعے میں ایسی تحریریں جگہ جگہ بکھری ہیں اور ایسے واقعات جگہ جگہ پھیلے ہیں کہ جن کے آئینے میں آپ کو صاحبِ مجموعہ کا چہرہ نظر آئے گا اور آپ فوری طور پر ان پر ہنسنے لگیں گے لیکن پھر اچانک آپ کو احساس ہوگا کہ مزاح نگار نے اپنے آپ کو نشانہ بنانے کی آڑ میں کن مسائل کی طرف انگشت نمائی کی ہے۔ دراصل رضوان اللہ کے ہاتھ میں ایک ایسا نشتر ہے جو ہر زخم اور ناسور پر وار کرتا ہے اور اس نشتر زنی کے بہانے صاحب

مضمون اپنا کام کر جاتے ہیں۔

رضوان اللہ صاحب دراصل بنیادی طور پر ایک صحافی ہیں۔ سماجی مسائل کی نبض پر ان کی گرفت ہے۔ انھوں نے سماجی برائیوں کی طرف توجہ دہانی کا کام صرف صحافت سے نہیں لیا بلکہ انھوں نے اس کے لیے طنزیہ مزاحیہ تحریروں اور شاعری کا بھی سہارا لیا ہے۔ ان کی نثر جتنی دل پذیر اور شگفتہ ہے ان کی شاعری بھی اتنی ہی مؤثر اور پر کشش ہے۔

رضوان صاحب صرف اردو کے صحافی نہیں ہیں ان کو انگریزی پر بھی اتنی ہی قدرت ہے جتنی کہ اردو پر۔ ایک انگریزی ہفت روزہ میں آپ کا مستقل کالم پڑھا جا سکتا ہے۔ آپ کا خمیر اعظم گڑھ کی زرخیز زمین سے اٹھا ہے اور اس میں جگہ جگہ کی مٹی کی خوشبو بھی رچ بس گئی ہے۔ اس کا ثبوت ان کا یہ اعتراف ہے۔

> ''عمر کے ابتدائی ۲۲ر برس یوپی کے شہروں قریوں میں قسمت سازی کرتے رہے جن میں بنارس اور کانپور کی مہمات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ پھر ۲۷ر برس کلکتہ کی زلف گرہ گیر کے اسیر رہے۔ ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کے دوران دہلی میں اسیری کا پروانہ موصول ہوا۔ اس کو بھی تقریباً ۲۲ ر برس ہونے کو آئے ہیں۔ اس تمام اثناء میں دل پرخوں نے نہ جانے کیا کیا دیکھا۔''

غالباً رضوان اللہ کا یہ پہلا طنزیہ مجموعہ ہے۔ ہم ان کے مضامین اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں، البتہ مجموعہ دیکھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا۔ یہ مضامین اخباروں کے لیے لکھے گئے تھے جن میں سے بعض شائع بھی ہوئے ہیں اور بہت سے مضامین ایسے ہیں جو نئے اور غیر مطبوعہ ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ فوراً اس دعوے کو سچ ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ'' آپ کا ذوق بہت صاف ستھرا اور بھانڈ پن سے پاک ہے۔ موضوعات میں تنوع اور وسعت ہے، اسلوب نگارش انتہائی جاندار اور شگفتہ ہے اور انسانی

جذبوں سے لبریز ہے۔''

رضوان صاحب ایک خود دار اور غیرت مند قلم کار ہیں۔ صوفی منش قسم کے آدمی ہیں اور شہرت و ناموری سے دور رہنے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ اردو صحافت کے صفحات پر آپ کے قلم کے نقوش بکھرے ہوئے ہیں لیکن صلہ وستائش کی تمنا سے بے پروا ہونے کے ان کے مزاج نے ان کو وہ شہرت حاصل نہیں کرنے دی جو ان سے بہت کم صحافتی تجربات والے حاصل کر لیتے ہیں اور نہ جانے کتنے ایوارڈ وانعام اپنی جھولی میں ڈال لیتے ہیں۔ چونکہ آپ کے ضمیر میں جگہ جگہ کی مٹی کی خوشبو رچی بسی ہے اسی لیے آپ کی تحریر میں بھی اس کی جلوہ گری ہے۔ مشرق کی اصطلاحوں اور مقامی بولیوں کی آمیزش نے ان کی تحریر کو انتہائی خوشگوار بنادیا ہے۔

رضوان صاحب کو قلم پر کتنی قدرت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے بعض مضامین ایسے ہیں جن کو پڑھتے وقت ہونٹوں پر باریک سا تبسم دوڑ جاتا ہے اور بعض تحریریں ایسی ہیں جن کو پڑھتے ہی قہقہوں کی بارش ہونے لگتی ہے اور ایک جملے سے دوسرے جملے تک پہنچنے میں وقت لگ جاتا ہے۔ ایسی تحریریں پڑھ کر آپ ضرور لوٹ پوٹ ہو جائیں گے۔ ان میں ''سب سے پہلے مرغا''، ''ایک بکرے میں دو قربانی''، ''ووٹ دو ووٹ دو'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جن مضامین کو پڑھ کر ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم رقص کرنے لگے ان میں ''کمبخت مرتی ہی نہیں''، ''ادب برائے ادب''، ''بوڑھوں کا ادب''، ''جہیز کمزوریوں کا شرطیہ علاج''، ''یہ گدھا اپنی فطرت میں صحافی ہے نہ قاری ہے'' قابل ذکر ہیں۔

رضوان صاحب کی شاعری کے بارے میں بس اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ وہ شاعری نہیں ایک نشتر ہے جو نظموں اور ناسوروں کو نشانہ بناتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم ''دلی نامہ'' ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دروں سے متصل ہیں گھر، گھروں میں ہیں مزارہا
پرانی دلی جایئے، کباب سیخ کھایئے
وہیں پہ دیکھ آیئے، غرارہا شرارہا
کہاں ہے اردو کیا ہوئی، کسی کو اس کی کیا پڑی
کھڑی وہ دیکھتی رہی گلے میں سب کے ہارہا

☆☆

کرپشن کے ہم ہیں ہمارا کرپشن
یہ سب کی نگاہوں کا تارا کرپشن
کرپشن نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا
جو رنگینیاں ہیں یہ سارا کرپشن

☆☆

سب کہاں کچھ جاکے کلبوں میں نمایاں ہوگئیں
واں بہارِ جاں فضا دکھلا کے پنہاں ہوگئیں
تھیں بنات النعش دلی کب سے پردے میں نہاں
دفتر و کالج میں جب پہنچیں تو عریاں ہوگئیں

اوراقِ مصور

پہلے ''بے ادبیات'' اور اب ''اوراقِ مصور'' یعنی رضوان اللہ کی شخصیت کے بالکل دو متضاد پہلو۔ ایک میں طنز و مزاح کا اعلیٰ نمونہ تو دوسرے میں سنجیدہ شاعری کی جادو بیانی۔ جنھوں نے صرف ''بے ادبیات'' کا مطالعہ کیا ہے انھیں بھی میری طرح اندازہ نہیں رہا ہوگا کہ آنجناب لطیف اور باریک پیرائے میں جتنا گہرا طنز کرتے ہیں، سنجیدہ شاعری میں بھی اپنی شخصیت کی اتنی ہی گہری چھاپ چھوڑتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ملیں

گے جو نثر اور نظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہوں اور شاعری کے ذریعے طنز و مزاح کے نشتر لگانے کے ساتھ ساتھ اپنی نثری تحریروں سے بھی سماجی برائیوں کا اس انداز میں آپریشن کرتے ہوں کہ آپریشن کرانے والا ہنسی خوشی اس کو جھیل جائے اور اسے انستھیسیا دینے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

لطیف اور باریک پیرائے میں سماجی ناہمواریوں کی تصویر کشی جتنا مشکل کام ہے اس سے بھی مشکل کام اپنے اوپر ہنس کر اپنے عہد کی برائیوں اور خامیوں کو اجاگر کرنا ہے۔ ''خود ہنسائی'' کی آڑ میں سماج کو آئینہ دکھانا نہ صرف بہت بڑا فن ہے بلکہ بڑے دل گردے کی بھی بات ہے۔ اور یہ کام وہی انجام دے سکتا ہے جو اعلیٰ ظرف ہو اور جو کینہ کی شکل میں پھیلی سماجی برائیوں کے علاج کی تڑپ بھی اپنے دل میں رکھتا ہو۔ رضوان اللہ خود پر ہنس کر سماج کو ہنساتے اور آئینہ دکھاتے ہیں۔ اپنی ان تخلیقات کو جو ''بدنظمیاں'' اور اپنی تصانیف کو ''ناتجربہ کاریاں'' قرار دینے کے لیے جس حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب میں نہیں پایا جاتا۔ یہ کتاب دراصل ایک مثنوی ہے جس میں کلکتہ کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔ چونکہ آپ نے کلکتہ میں ۲۷ رقیمتی سال گزارے ہیں اس لیے آپ نے کلکتہ کی تاریخ منظوم کرنے کو اپنے اوپر فرض کر لیا تھا اور اسی فرض اور قرض کی ادائیگی کا عملی نمونہ ہے اوراقِ مصور۔ جنھوں نے کلکتہ نہیں دیکھا ہے ان کے لیے یہ کتاب ایک بائیسکوپ کی مانند ہے جو اس شہر کی ایک جھلک دکھا کر اس کا دیوانہ بنا دیتی ہے۔

''تشکرات" کے عنوان سے پیش لفظ میں رضوان اللہ لکھتے ہیں:

''میں نے وقتاً فوقتاً اپنے احساسات کی منظوم ترجمانی کی، ان کو رکھتا گیا اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ان کو مرتب کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اتنی مدت کے دوران جس کا احاطہ کیا گیا، دنیا نہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ جس شہر کا مصفیٰ و مجلّٰی نقش ذہن پر مرتسم تھا اس کا حلیہ بنتے بگڑتے نہ معلوم کیا سے کیا ہو گیا۔ خود ہمارا حلیہ نہ

معلوم کیا سے کیا ہوگیا۔ جسے جاننے پہچاننے والے زمانے کی بھیڑ میں نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔ اب نہ وہ ہمیں جانتے پہچانتے ہیں نہ ہم ان کو۔ لیکن بہ ایں ہمہ ہمیں اپنے کام سے کام ہے۔ وہ کام جس کی نیت کسی مقبولیت کی گھڑی میں باندھی گئی۔''

یہ محض اقتباس نہیں ہے بلکہ آنجناب کا درد وکرب ہے، اندرونی تڑپ ہے۔ اس اقتباس میں جہاں کلکتہ شہر کی تاریخ منظوم کرنے کی پر خلوص نیت کا اعلان ہے، وہیں خود کو نہ پہچانے جانے کا تکلیف دہ احساس بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ستائش کی تمنا اور صل کی پروا کیے بغیر اپنا کام کرنے کی لگن اور تڑپ بھی ہے۔ صحافتی خدمات، قحط بنگال، ۱۹۴۶ء کے فسادات، تقسیم بنگال، نکسلی دور، کلکتہ میں ہونے والی ہڑتالیں، وہاں کا کلچر اور پھر وہاں کے معروف مقامات۔ کیا کچھ نہیں ہے اس کتاب میں۔ چینا پاڑہ یعنی چائنا گاؤں پر چار اشعار کی یہ خوبصورت نظم ملاحظہ فرمائیں:

مچھلی کی گر بساند ہو مرغوب آیئے
جھینگے کے عطرِ خاص میں کپڑے بسایئے
کچھوے ملیں گے چائنا ٹاؤن میں جایئے
کچھ کیکڑے بھی ڈال کے تھیلے میں لایئے
ٹینگریں روہو شوق سے ہلسا پھنسایئے
لازم نہیں کہ جال کہیں پر بچھایئے
مچھلی کی اتنی قسمیں ہیں قربان جایئے
کھانے کے وقت میز کی رونق بڑھایئے

نظم ''کلکتہ کو آخری سلام'' کے بعض اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اے کلکتہ اے مخزن عرفان و آگہی

بانگ سروش ہے تری پل بھر کی خامشی
فکرِ رسا ہے تیری زمانے سے تیز تر
پہنائے ممکنات سے آگے تری نظر
تیری نظر میں حکمتِ دانائے چین ہے
تیری فضا میں نزہتِ روح الامین ہے

ان اشعار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رضوان اللہ کو کلکتہ شہر سے عشق تھا جبھی تو انھوں نے عقیدت کی گہرائیوں میں ڈوب کے یہ نظم تخلیق کی ہے۔ اسی طرح مسجد ناخدا کے دو اشعار دیکھیں:

جس کی اذاں سے ہوتی ہے بیدار ہر سحر
ہر چپہ جس کا صاحب ایماں کی سجدہ گاہ
جس کے منار حرمت و تکریم کے گواہ

''اوراقِ مصور'' کے مطالعہ کے وقت کہیں نظیر اکبرآبادی یاد آجاتے ہیں تو کہیں ڈاکٹر اقبال۔ اس کتاب میں جو شاعری ہے وہ بڑی متاثر کن ہے کہ ایک بار اس کا مطالعہ شروع کیجیے تو جب تک پوری کتاب ختم نہ کرلیں طبیعت سیر نہیں ہوتی۔

اس کے ساتھ محمڈن اسپورٹنگ، درگا پوجا، بابو، ٹراموے، وکٹوریا میموریل اور سب سے خاص پہچان ہاوڑہ کا پل۔ گویا ایک منظوم فلم ہے جو ہمیں گھر بیٹھے کلکتہ کی سیر کراتی اور اس کے ماضی و حال سے روشناس کرادیتی ہے۔

■❖■

اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

سید عبید الرحمٰن، نئی دہلی

رضوان اللہ صاحب سے میری پہلی ملاقات دہلی میں شاید سن 1999ء میں سرسری طور پر ہوئی تھی۔ ممبئی سے جرنلزم کرنے کے بعد چند ماہ میں نے دہلی کے ایک اخبار میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر کام کیا تھا۔ رضوان صاحب کا ایک کالم اس اخبار میں مستقل شائع ہوتا تھا۔ لیکن تفصیلی ملاقات کا ہونا ان سے یاد نہیں۔ یہ ضرور یاد ہے کہ ان کے مضامین زبان و بیان کے اعتبار سے اخبار کے بہترین کالمز میں شمار ہوا کرتے تھے جن میں مجھے تصحیح کرنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑی۔ ان سے تفصیلی ملاقات کا اتفاق اس کے ایک دہائی کے بعد نصیب ہوا اور پھر یہ ملاقات تقریباً مستقل ہونے لگیں۔

2017ء میں جب تاریخ پر میری پہلی کتاب انگریزی میں شائع ہوئی اور اس وقت اس کے اردو ترجمہ کی اشاعت ہوئی تو رضوان اللہ صاحب کا فون آیا۔ انھوں نے نہ صرف کتاب کی تعریف کی بلکہ مجھ سے کہا کہ آپ نے مسلم مجاہدین آزادی کے اوپر انگریزی میں کتاب لکھ کر ایک بڑا کام انجام دیا۔ انھوں نے صرف کتاب کی تعریف پر ہی بس نہیں کیا بلکہ اس پر ایک تفصیلی بک ریویو لکھ کر مجھے بھیج دیا جو میں نے شاید ریڈینس میں

اشاعت کے لیے بھیج دیا اور وہ وہاں سے شائع ہوا۔ مجھے بہت حیرت بھی ہوئی کہ انھوں نے اپنی پریشانیوں بالخصوص اپنی اہلیہ کی بیماری کے باوجود نہ صرف کتاب اول تا آخر پڑھی بلکہ اس پر ایک مفصل تبصرہ بھی تحریر کیا۔ اس کے بعد 2019 میں جب میری کتاب Ulema's Role in India's Freedom Movement شائع ہوئی تو اس پر بھی انھوں نے تبصرہ لکھا اور 2021 میں میری کتاب Biographical Encyclopedia of Indian Muslim Freedom Fighter پر بھی تفصیلی تبصرہ لکھا۔ یہ دونوں تبصرے میں نے سیاست میں شائع ہونے کے لیے بھیج دیئے، جہاں سے وہ شائع ہوئے۔ انھوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ کئی بار مجھ سے زور دے کر کہا کہ ''عبید صاحب، اگر آپ کو کتابوں میں کسی طرح کے تعاون کی ضرورت ہو تو میں ہر طرح سے تیار ہوں۔'' میں نے شکریہ کے ساتھ ان سے معذرت کرلی لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ ان کو تاریخ اور اس کے documentation کی اہمیت کا ہندوستان کی راجدھانی کے کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ اندازہ تھا۔ ان کے ریٹائرمنٹ کو کئی دہائیاں گزر گئی تھیں لیکن اس کے بعد بھی کاز کے تئیں ان کی سنجیدگی اور Dedication ہم نوجوانوں سے کہیں زیادہ تھا۔ ایک بار ان کے گھر پر ہی گفتگو چل رہی تھی، جب انھوں نے مجھ سے کہا کہ ''ہندوستان میں اردو کی تاریخ کو document کرنے کی شدید ضرورت ہے کیونکہ sources عنقا ہوتے جارہے ہیں اور کوئی شخص ایسا نہیں دکھتا کہ اس پر سنجیدگی سے کام کرسکے۔ میں عمر کے اب اس مرحلہ میں ہوں جب میں اس کو شروع نہیں کرسکتا کیوں نہ آپ اس کام کو اپنے ذمہ لے لیں۔ Funding کی ذمہ داری کسی حد تک میں لے سکتا ہوں۔'' میں نے رضوان اللہ صاحب کی طرف غور سے دیکھا۔ ان کی عمر اس وقت تقریباً نوّے سال کے قریب تھی لیکن ان میں جذبہ اب بھی نوجوانوں والا تھا۔ میں نے کہا کہ اردو سے میرا تعلق محض ایک قاری کی حد تک کا ہے اور میں اس میدان کا آدمی نہیں کہ اسے justify کرسکوں۔ لیکن اگر ہم ایک ٹیم بنا کر اسے کرنے کی

کوشش کریں تو مجھ سے جو بھی ہوسکے گا انشا اللہ پورا تعاون دینے کی کوشش کروں گا۔ انھوں نے اس کے بعد اس کام کا ایک خاکہ بھی WhatsApp سے PDF کی صورت میں بھیجا۔ میں اس وقت ایک دوسری کتاب میں مصروف تھا اس لیے میں اس پر ان سے گفتگو نہیں کر سکا۔

رضوان اللہ صاحب کی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی Sincerity اور 'Never Say die Spirit' تھی۔ جس وقت ان کی اہلیہ بیمار تھیں اور یہ رات بھر جگ کر ان کی تیمارداری کیا کرتے تھے، تقریباً اٹھاسی، نوے سال کی عمر میں، اس وقت بھی وہ اپنی ویب سائٹ کے لیے مضمون لکھتے، اس کو ٹائپ کروانے کے لیے خود خالد فیصل صاحب کے پاس جاتے، اس کی ایڈیٹنگ کرتے اور پھر اس کو اپنی ویب سائٹ پر اپ لوڈ کرواتے۔ اسی دوران ان کی کئی کتابیں بھی آئیں۔ وہ کتابوں کو پڑھتے بھی اور ان پر تبصرہ بھی کرتے۔ ان کی بایوگرافی ان کے انتقال سے محض کچھ ماہ قبل شائع ہوئی۔ میں نے گزشتہ سال ستمبر میں ان پر ٹوئیٹر پر ایک تفصیلی تھریڈ لکھا جس میں ان کی شخصیت اور کام پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مجھے واٹس اپ پر ایک میسج کیا اور کہا کہ ''مجھے گمنامی میں ہی رہنے دیں۔ میری عافیت اسی میں ہے۔'' انھوں نے مزید لکھا کہ ''کتاب کی خبر ملتے ہی معلوم نہیں کہاں، کہاں سے ملاقاتی خیریت دریافت کرنے آجاتے ہیں۔ مجھ سے بیٹھا نہیں جاتا اور ان میں سے خریدار کوئی نہیں۔'' رضوان اللہ صاحب کے Energy Level نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا۔ ان کو پڑھنے، لکھنے کے علاوہ کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ اور وہ چاہتے تھے کہ ہر شخص کی تشجیع کریں اور آگے بڑھنے میں اس کی مدد کریں۔

حالانکہ رضوان اللہ صاحب اور میری عمر میں تقریباً نصف صدی کا فرق تھا لیکن ہم جب بھی بیٹھتے تو گفتگو کے دوران عمر کی دیوار ٹوٹ جاتی تھی۔ وہ اپنی اہلیہ سے بہت محبت کرتے تھے، جس طرح انھوں نے اپنی اہلیہ کی تیمار داری کی وہ Legendary تھا۔ کئی

بار انھوں نے کہا کہ میں اہلیہ کو کیسے بھول جاؤں۔ انھوں نے زندگی بھر کبھی گرہستی کا بوجھ مجھ پر نہیں ڈالا۔ بچوں کی تربیت خود کی اور خوب کی۔'' یہ بات انھوں نے مجھ سے ایک بار نہیں بلکہ کئی بار کہی۔

رضوان صاحب نے بہترین اور بھرپور زندگی گزاری۔ ان کو exposure بھی خوب ملا۔ اردو اور انگریزی زبانیں ان کے گھر کی لونڈی تھیں اور دونوں زبانوں میں وہ بہترین انداز سے لکھتے تھے۔ دنیا جہاں کے سفر کیے۔ کلکتہ اور دہلی میں movers & shakers سے ان کے تعلقات تھے لیکن ان تعلقات سے انھوں نے کبھی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا۔ کبھی ان میں تعلّی کی ایک جھلک بھی نہیں دکھی۔

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کے لیے کس کس کا ماتم کیجیے

■❖■

رضوان اللہ فاروقی

'اوراقِ مصور' کے آئینے میں

حقانی القاسمی، نئی دہلی

کچھ کتابیں نقاد کی چند مبہم اور مغلق سطروں میں ہی زندہ رہتی ہیں۔ سطروں کے معدوم اور مضمون کے مرحوم ہوتے ہی اس کتاب کی بھی موت ہو جاتی ہے۔ مگر کچھ خوش بخت کتابیں منت طفلاں اٹھائے بغیر بھی زندہ و تابندہ رہتی ہیں۔ زمانے کے سرد و گرم جھیلتی ہوئی کئی یگوں کا سفر طے کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں جن دو کتابوں کا یہاں ذکر کر رہا ہوں ان دونوں کو نہ کسی نقاد کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی تنقیدی فتوی یا فرمان کی۔ ان میں ایک کتاب 'اوراقِ مصور' کو اگر مستقبل بعید کے تناظر میں پڑھا جائے تو شاید اس کی معنویت اور زیادہ روشن ہوگی۔ کیونکہ جس طرح آج ہمارے لیے تزک بابری، گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ! فاہیان میگستھنیز برنیر کے سفرنامے بہت اہمیت کے حامل ہیں یا زمانے کے حالات نے ان کی اہمیت دو چند کر دی ہے۔ اسی طرح آنے والے زمانے میں جب کلکتہ کا کولاژ تیار کیا جائے گا تو اس کتاب کی اہمیت مترشح ہوگی کیونکہ 'اوراقِ مصور' میں رضوان اللہ کی آنکھیں، ان کی دھڑکنیں اور ان کا سوز و ساز بھی شامل ہے اور یہ ایک چشم دید بیانیہ

ہے اور آنکھوں دیکھا منظر نامہ جسے کسی طرح مسخ نہیں کیا جا سکتا۔

کتابوں کی قرأت کے کئی تناظر ہوتے ہیں۔ امیر خسرو کی مثنوی کو ہم ماضی کے تناظر میں پڑھتے ہیں تو ہمیں ''دلی'' قبۃ الاسلام نظر آتی ہے اور آج کے تناظر میں پڑھتے ہوئے افسردگی کا احساس ہوتا ہے۔ میں پھر زور دے کر یہ کہنا چاہوں گا کہ رضوان اللہ صاحب کی کتاب 'اوراقِ مصور' کو آج کے تناظر میں نہیں بلکہ مستقبل بعید کے تناظر میں پڑھا جائے تو زیادہ افادی پہلو نظر آئیں گے کیوں کہ اس کی ایک ایک سطر میں ہمارے لیے ایک ایسے شہر کی تاریخ اور تہذیب کا حوالہ موجود ہے جو آج زندہ ہے مگر آج کی یک قطبی دنیا میں کوئی بعید نہیں بلکہ بہت ممکن ہے آنے والے کل میں کلکتہ بے نام ونشان ہو جائے۔ تب یہی 'اوراقِ مصور' حرمت الاکرام و کلکتہ: ایک شہر رباب The City of Joy اور دِگر کتابیں اس نسل کی رہنمائی کریں گی جس نسل نے کلکتہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں ہے۔ میں نے بھی بغداد نہیں دیکھا ہے مگر میں ابھی تک بغداد میں ہوں۔ میرا دل دجلہ و فرات میں ہے۔ خطیب البغدادی کی ''تاریخ البغداد'' میں جو چودہ ضخیم جلدوں پر محیط ہے اور میں اس مدینۃ السلام جیتے جاگتے شہر کو کھنڈر میں تبدیل ہوتے بھی دیکھ رہا ہوں۔ خطیب البغدادی کی تاریخ میں جو بغداد ہے وہ تاریخ و تہذیب کا محور ہے۔ حمورابی تہذیب کے شہر بابل و نینوا کا مرکز۔ اب خطیب البغدادی کا وہ بغداد نہیں رہا جو شاید المدینۃ الفاضلہ کا مثالی ماڈل تھا۔ اب صرف ایک تاریخ رہ گئی ہے۔ جب کسی شہر کا قتل ہوتا ہے تو اس کی تہذیب بھی دم توڑ دیتی ہے۔ شہر سو جاتے ہیں تو تہذیبیں بھی خوابیدہ ہو جاتی ہیں۔ کسی کسی شہر میں تو سویرا ہی نہیں ہوتا۔ رات ہی طاری ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ میر تقی میرؔ کے زمانے کی جو دلّی تھی اس پر رات حاوی تھی، ناصر کاظمی نے لکھا ہے کہ:

> ''میرؔ صاحب کے زمانے اور ہمارے زمانے میں بڑا بعد ہے۔ دنیا اتنی بدل چکی ہے کہ آج کے شاعر کے سامنے پہلے سے بھی کہیں وسیع منظر حیات کھل گیا ہے مگر

واقعات کی مماثلت کی وجہ سے میر صاحب کا زمانہ ہمارے زمانے سے مل گیا ہے۔ میر کا زمانہ رات تھا۔ ہم نے صبح کی روشنی میں آنکھ کھولی ہے۔ نیا سورج ناچ رہا ہے۔ ہمیں للکار رہا ہے اور یہ رات میر کی شاعری میں زندگی کا استعارہ ہے۔ رات آرام کے لیے ہے مگر میر کے زمانے میں یہ رات گزار لینا بھی بڑا کام تھا۔ انہوں نے اس رات کو محض رو پیٹ کر نہیں گزارا بلکہ اس ویران رات کے سناٹے میں کچھ شب چراغ روشن کیئے۔ وہ شاعر تھے۔ تلوار لے کر بھی نکلتے تو کیا کرتے۔ کوئی کفن بھی نہ دیتا۔ انہوں نے اپنے معاشرے کو آئینہ دکھا کر عبرت دکھائی۔ جگانے کی کوشش کی۔ میر ہمیں اس رات میں چھوڑ گئے مگر علم اور عرفان کی شمع جلا گئے۔ سرسید اور اُن کے رفقاء نے اس رات کو گزارنے کا منصوبہ بنایا اور اقبال آئے تو رات کا خاصا حصہ گزر گیا تھا۔ اقبال نے دن کے قدموں کی آواز سنی تھی۔ میں نے میر کے زمانے کو رات کہا تھا۔ یہ رات ہمارے زمانے کی رات سے آملی ہے۔ قافلے کے قافلے اس رات میں گم ہو گئے اور جو بچ نکلے وہ اُس سے اب تک لڑ رہے ہیں۔ یہ روحانی واردات جو بیک وقت انفرادی بھی تھی اور اجتماعی بھی جو ہماری فضائے یاد میں اظہار کے لیے بے چین ہے۔''

میر کے زمانے کی یہ رات اب ناصر کاظمی کے عہد سے گزر کر ہمارے عہد میں بھی داخل ہوگئی ہے اور ہم ابھی تک اس رات کی ہولناکیوں اور سناٹوں میں ہیں اور اپنے شہروں کی سیاہی میں تہذیب کی تاریکی کو محسوس کر رہے ہیں۔ ٹکشیلا، متھرا، بندرابن، کلکتہ، دلی، بغداد، غرناطہ، قرطبہ، اشبیلیہ صرف شہر نہیں بلکہ تہذیبی استعارے ہیں اور وحشی قبائل اور غیر متمدن اقوام نے ہمیشہ ان تہذیبی استعاروں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی ہے اور کوششیں کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ ہندوستان کی ایک وشال سبھیتا ہے، ایک عظیم سنسکرتی ہے اور اس ملک کا شہر کلکتہ ایک تہذیبی ثقافتی محور ہے۔ ہمارے تہذیبی اور سیاسی عروج

وزوال کا گواہ، سیاسی اور اجتماعی انتشار کی آماجگاہ بھی۔ لارڈ کلائیو کی گوری حسینائیں بنگال کے ساحل پہ نہ اترتیں تو شاید ہماری قسمت میں غلامی کی تاریکی نہ ہوتی۔ ہمارے ضمیر ان کی زلفوں کے اسیر نہ ہوتے۔ ہماری زمین میں برطانیہ کا سورج نہیں اپنے آسمان کا سورج طلوع ہوتا۔ مجھے آج بھی لگتا ہے جیسے ہمارے آسمان میں سورج کسی اور ملک کا طلوع ہو رہا ہے۔ کلکتہ کی طرح دلی بھی محض ایک شہر نہیں ایک تہذیب ہے اور اس نے اپنی آنکھوں سے تہذیب کا عروج وزوال بھی دیکھا ہے۔ اس کے سینے میں بھی بہت سارے زخم اور دل میں درد ہیں جس کی کراہ کو ہم ابھی تک محسوس کر رہے ہیں۔ اس کے چپے چپے پر ہمارے تہذیبی نقوش کندہ ہیں جنہیں مٹانے کی کوشش محض اس لیے کی جاتی ہے کہ ہمیں تاریخ و تہذیب سے جلاوطن کر دیا جائے۔

ہمارے تہذیبی استعارے جو شہروں کی شکل میں ابھرتے تھے، وہ سب معدوم ہوتے جارہے ہیں۔ ہمارے ذہنی افق سے ہمارے تہذیبی حوالے منہدم ہوتے جاتے ہیں۔ اصفہان، شیراز، سمرقند و بخارا یہ سب ہماری تہذیب کے گہوارے اور استعارے تھے۔ ان شہروں کی زندگی میں ہماری تہذیب زندہ تھی اور شہروں کی موت سے ہی ہماری تہذیب پر مرگ طاری ہوا۔ بغداد کی موت صرف ایک شہر کی نہیں بلکہ تاریخ اور تہذیب کی موت ہے۔ کلکتہ بھی ایک ایسا شہر ہے جس کے پاس اب صرف کڑوا کسیلا کلچر ہی رہ گیا ہے۔ ودیاساگر، اسوتوش، رابندر ناتھ اور سبھاش چندر بوس کے کلکتے کے کالے بال اب سفید ہونے لگے ہیں۔ اس کا سینہ سوز سے خالی ہوتا جارہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اب وحشت کا طوفان ہے۔ دلی اور کلکتہ تہذیب کے دو محوروں کا وصال۔ دو معاشرت، سماج اور سیاست کا اتصال ہے۔ رضوان اللہ کے 'اوراق مصور' میں کلکتہ بھی ہے اور دلی بھی— اس سے ہمیں کلکتہ کے کل، آج اور کل کے بارے میں بہت سی معلومات ملتی ہیں اور دلی کے دل کا حال معلوم ہوتا ہے۔ 'اوراقِ مصور' میں تاسیس کلکتہ، قحط بنگال، ۱۹۴۶ء کے فسادات،

تقسیم ہند، نکسلی دور، ہڑتال کا بیان بھی ہے اور ہوڑہ پل، کلکتہ میدان، چورنگی، سونا گاچھی، وکٹوریہ میموریل، ٹرام وے، مسجد نا خدا، رکشے، درگا پوجا، محمڈن اسپورٹنگ کی جھلکیاں بھی اور کلکتہ کی ادبی، ثقافتی کا تذکرہ خیر بھی، دلی کے تاریخی کھنڈرات ۱۹۸۴ء کے فسادات اور تازہ ترین صورتِ حال کا بیان بھی ہے اور یہ سب معلومات اس مثنوی کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ بہت سے شہروں کا سراغ شاعری ہی سے ملا ہے۔ شاعری روزنامچہ بھی ہے، تاریخ بھی۔ امرؤ القیس کی شاعری سے بھی بہت سے شہروں کے سراغ ملتے ہیں جب وہ محبوب کے دیار کا ذکر کرتا ہے تو اس میں بھی کچھ شہر روشن ہو جاتے ہیں۔ بہت سے مقامات کی تعیین اور تشخیص میں شاعری سے مدد لی گئی ہے۔ حتیٰ کہ اربابِ تاریخ نے عربی قصائد سے عرب جغرافیے کی تشکیل کی ہے۔ دورِ جاہلی کے بہت سے قصائد ایسے ہیں جن میں معشوق کے دیار کا ذکر ملتا ہے۔ اُن سے بھی جغرافیہ نویسی میں مدد لی گئی۔ عربوں میں ایک اچھی بات یہ بھی تھی کہ انہوں نے اپنی تمدنی اور تہذیبی تاریخ کی تشکیل میں بہت ہی مستعدی کا ثبوت دیا۔ اُن مقامات، آثار کی تلاش و تفتیش کی جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔ اور قابلِ فخر بات یہ ہے کہ تمدنی، عمرانی تاریخ اور تہذیبی شعور کو بیدار کرنے میں عرب مفکرین کا ہی نمایاں کردار رہا ہے۔ ابنِ خلدون اور ابنِ رشد نے ہی تہذیبی اور تاریخی انجماد کو توڑا ہے۔ اشپنگلر اور ٹائن بی تو بعد کی پیداوار ہیں جنہوں نے تہذیبی عروج و زوال کی نشاندہی کی، ابنِ رشد تو اتنا نمایاں نام ہے کہ اس نے تو مغربی تہذیب کے جمود کو توڑا، جس کا اعتراف، بیکن اور توماس اکویناس نے بھی کیا ہے۔ ابن الحوقل کی ''کتاب المسالک'' میں عرب کے پہاڑ، راستے، ریگستان۔ بشاری مقدسی کی کتاب ''احسن التقاسیم فی معرفتہ الاقالیم'' میں کھنڈرات، عمارات، معدنیات کا بیان ہے۔ یاقوت کے ''معجم البلدان'' ابوالفدا کے ''تقویم البلدان'' میں عرب کے طول و عرض بلد کا ذکر ہے۔ مسعودی کی ''مروج الذہب'' میں بھی وہاں کا جغرافیہ ہے۔ حتیٰ کہ

عرب جغرافیہ نویسوں میں سے ابن حائک ہمدانی نے ''صفتہ جزیرۃ العرب'' میں نہ صرف قبائل اور اقوام کا ذکر کیا ہے بلکہ حیوانات، پہاڑ، تالاب، چراگاہ، وادی، معدنیات اور آثارِ قدیمہ کا بھی بیان کیا ہے۔ محمود بن عمر زمخشری نے ''کتاب الامکنۃ والمیاہ، والجبال'' میں عرب کے تالاب، پہاڑ اور مقامات کا ذکر کیا ہے۔ حسن بن محمد نے ''کتاب الاودیۃ والجبال'' ابوسعید حسن السکری نے ''کتاب المنابل والقریٰ'' میں عرب کی گھاٹیوں کا ذکر کیا ہے۔ سعدان بن مبارک نے ''کتاب الارضین والمیاہ والجبال'' ابوسعید الاسمعی نے ''کتاب میاہ العرب'' نضر بن شمیل اور ابوزیاد کلابی نے ''کتاب النوادر''، ''کتاب الصفات'' لکھ کر نہ صرف اپنی جغرافیہ نویسی کا ثبوت دیا بلکہ ان کی کتابوں میں تمدنی اور تہذیبی شعور کی روشنی بھی ہے۔ قومیں مٹ گئیں، تہذیبیں نیست و نابود ہوگئیں، یونان مصر وروما سب تہذیبوں کا خاتمہ ہوا۔ مگر اب بھی اس کے آثار موجود ہیں۔ ملکہ بلقیس کا شہر سبا آج بھی زندہ ہے۔ آج بہت سے شہروں کا خارجی وجود ختم ہو چکا ہے۔ مگر ان کا وہ معنوی وجود روشن ہے۔ قرآن کریم میں بہت سے شہروں کے تذکرے ہیں۔ مگر ان کے نشانات معدوم ہیں یا ان مقامات کا تعیین دشوار ہے۔ اب ماہرین آثار قدیمہ اُن شہروں کی شناخت کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ دراصل تاریخ اور جغرافیہ ہی ہماری تہذیب کو زندہ رکھنے کا کام کرتے ہیں۔ شہر شناسی ایک بہت بڑا فن ہے۔ ہمارے عرب مورخین نے شہر نگاری کی ایک اچھی روایت قائم کی۔ رضوان اللہ صاحب نے 'اوراقِ مصور' میں دراصل اُس شہر کے ایک ایک منظر نامے کو حیات نو عطا کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمارے ہندوستان کی سانسوں میں دھڑکتا ہے۔ اُس کے لیے انہوں نے مثنوی کی صنف کا سہارا لیا ہے۔ مثنوی کا مروجہ فارم کیا ہے یا اُس کی ہیئت کیا ہے اس بحث سے قطع نظر رضوان اللہ کی یہ مثنوی اپنے مفاہیم اور معانی کی ترسیل میں مکمل طور سے کامیاب ہے۔

رضوان اللہ صاحب نے اس مثنوی میں اپنے شہر ہجر کو ہمارے شہر وصال میں

بدل دیا ہے۔ مگر بقول جگر مراد آبادی ہمارا وصال بھی ہجر سا ہے اور اُن کا ہجر بھی وصال سا ہے۔ اُن کے ذہن اُن کی دھڑکنوں میں اب بھی کلکتہ بستا ہے۔ کلکتے کی دھڑکنیں اب بھی سنائی دیتی ہیں اور ہمارے لیے کلکتہ ہنوز دور است ہے۔ غالب نے کلکتہ کا ذکر کیا تو ایک عجب وارفتگی اور والہانہ کیفیت کے ساتھ اور میر کے یہاں جو دلی ہے وہ ان کا دل بن جاتی ہے۔ رضوان اللہ صاحب کی اس مثنوی میں صرف تاریخیت نہیں ہے بلکہ ایک پر اسرار شمولیت بھی ہے۔ جب شہر کی سانس میں اپنی سانس شامل ہو جائے تو پھر شہر، آدمی کی سانسوں کی طرح دھڑکنے اور مہکنے لگتا ہے۔ یہ اسی طرح کا تجسیمی عمل ہے جیسے ناصر کاظمی کے اس شعر میں ہے ...میرا دل تو اُداس ہے ناصر ...شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے۔ یا جیسے میر نے کہا جس کا مفہوم ہے کہ جو دل کا حال ہے وہی دلی کا حال ہے۔ دلی سے دل کی تجسیم کا یہ عمل دراصل یہی وہ پر اسرار شمولیت ہے جو کسی بھی تخلیق کو اعتبار اور جاودانی عطا کرتی ہے۔ مجید امجد اپنے وجود کے حوالے سے درخت کی شناخت کرتے تھے اور درخت کے کاٹے جانے کے عمل کو اپنے قتل سے تعبیر کرتے تھے۔ تو یہ احساس حساس ذہنوں میں ہی ہوتا ہے۔ یہ فنائیت بہت ہی مخصوص دلوں کو حاصل ہوتی ہے۔ کلکتہ شہر کی شناخت میں اپنی شمولیت رضوان اللہ صاحب نے بہت ہی کمال ہنر مندی سے دکھائی ہے۔ اسی طرح اُن کا دلی نامہ محض دلی کا ایک منظر نامہ نہیں ہے بلکہ دلی نامہ اور مثنوی کلکتہ میں ان کے دل کی دھڑکنیں ہیں جن میں بہت سے معانی اور مفاہیم مضمر ہیں جن کی تفہیم وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی جائے گی۔ 'اوراقِ مصور' کلکتہ کا کولاژ ہے اور اس میں شبدوں سے جو چتر کاری کی گئی ہے، وہ تصویریں انتہائی حسین ہیں ... اس میں فکر، معانی اور لفظیات کا حسن سمٹ آیا ہے۔

■❖■

اوراقِ ہستی

ایک چشم کشا خودنوشت سوانح حیات

محمد عارف اقبال
مدیر اردو بک ریویو، نئی دہلی

خودنوشت سوانح عمری یقینی طور پر اپنے عہد کی تاریخ کا حصہ ہوتی ہے۔ چند بہترین اور مستند خودنوشت سوانح میں سابق بیوروکریٹ، ادیب اور افسانہ نگار قدرت اللہ شہاب (مرحوم) کے 'شہاب نامہ' کو میرے نزدیک اولیت حاصل ہے۔ تقریباً بارہ سو صفحات پر مشتمل اس سوانح کے مطالعے کے بعد میرا احساس ہے کہ اگر 'شہاب نامہ' نہیں لکھا جاتا تو برصغیر کی تاریخ کے چند اہم حقائق اب بھی پردۂ اخفا میں ہوتے۔

ممتاز و معروف صحافی رضوان اللہ فاروقی کی زیرِنظر کتاب 'اوراقِ ہستی' کا مطالعہ بھی 'آزاد ہندوستان' کے بعض تاریخی حقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔ خواہ ناخوشگوار ہی کیوں نہ ہوں۔ رضوان اللہ صاحب (پیدائش 15 رجولائی 1931) جن کو قصداً میں فاروقی لکھوں گا کہ اسکول میں داخلہ کے وقت سہواً ان کے نام کے ساتھ 'فاروقی' نہیں لکھا گیا جس کے سبب وہ زندگی بھر اپنا نام صرف 'رضوان اللہ' بتاتے رہے اور اسی نام سے ان کی کتابیں بھی

چھپتی رہیں۔ یہ کس قدر صبر آزما آزمائش ہے کہ جب ان کے چھوٹے بھائی کا انتقال ہوا تو انھوں نے اپنے بھائی کو پروفیسر فیضان اللہ فاروقی لکھا لیکن اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ انھوں نے 'فاروقی' لکھنے سے گریز کیا۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی زہرہ فاروقی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شعبہ فارسی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ 2019 کے اواخر میں ان کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوگیا۔ اس سانحہ سے 90 سالہ رضوان اللہ صاحب ایک طرح سے قید تنہائی کے اسیر ہوگئے۔ دہلی میں واقع موجودہ امریکن سینٹر جو کبھی USIS کے نام سے جانا جاتا تھا، اس ادارے سے رضوان اللہ فاروقی تقریباً اٹھارہ سال وابستہ رہے، لیکن یہ وابستگی جتنی سحر انگیز اور پُرکشش معلوم ہوتی ہے، اس 'آپ بیتی' کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے اس ذہین صحافی کی زندگی ہر پل اور ہر لمحہ کتنی دشوار گزار جدوجہد میں گزری ہے۔

مصنف نے اس کتاب کے دیباچہ میں اپنی علمی، ادبی وصحافتی مصروفیات کی اسناد کے طور پر اپنی جن کتابوں کا ذکر کیا ہے ان میں چار کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی شامل ہے۔ انگریزی رسالہ 'ملی گزٹ' نکلا تو اس کے کالم نگار کے طور پر رضوان اللہ (فاروقی) نے تقریباً تین سو مضامین لکھے۔ اسی طرح امریکی سفارت خانے کا مایہ ناز اردو مجلّہ اسپین(SPAN) جاری ہوا تو اس کے لیے انھوں نے کوئی چار برسوں میں 272 مضامین کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ پھر اس کے بعد ان کی کتاب 'بے ادبیات' (2000)، 'اوراقِ مصور'(2002)، 'کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'(2006)، 'متاعِ سحر'(2008)، 'ہمارے گاؤں ہمارے لوگ'(2011)، My Reflection (2013) شائع ہوئیں۔ ان کتابوں سے بہت قبل 1975 میں رضوان اللہ صاحب نے کلکتہ کو الوداع کہنے سے قبل Urdu Sefltought لکھا تھا، جسے داس گپتا پرکاش نے شائع کیا تھا۔ لیکن اس سے بھی بہت قبل 1962 میں انھوں نے "Janson Primer" اور اس کے بعد "Janson Reader" نامی دو کتابیں لکھی تھیں، جسے دارالاشاعت اسلامیہ، کلکتہ نے شائع کیا تھا، جس کے نہ معلوم کتنے

ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

ابھی تک یہاں رضوان اللہ (فاروقی) کے چند اچیومنٹس کا تذکرہ ہی کیا گیا ہے ،لیکن اس خود نوشت آپ بیتی سے انداہ ہوتا ہے کہ' آزاد ہندوستان' میں ایک ٹین ایجر نوجوان کئی طرح کی محرومیوں کے ساتھ جب اپنی زندگی کا سفر شروع کرتا ہے تو کن دشواریوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اس کے سامنے نہ صرف اپنی تعلیم کا مسئلہ ہے بلکہ زندہ رہنے کے لیے روزگار کا سنگین مسئلہ بھی ہے۔ اپنے آبائی گاؤں سمبھی (اعظم گڑھ) سے دور کانپور، بنارس، لکھنؤ کی خاک چھانتے ہوئے کلکتہ کا سفر اور وہاں کی آزمائشیں نہ صرف جان لیوا ثابت ہوئیں بلکہ لڑکھڑاتے قدموں سے خود کو اللہ کے کرم سے گرنے سے محفوظ رکھنا عام ذہن وشعور رکھنے والے انسان کے بس میں نہیں ہوسکتا۔ اللہ کی نصرت اسے حاصل ہوتی ہے جو پختہ کردار کا مالک ہواوراللہ رب العزت پر کامل یقین رکھتا ہو۔

'اوراقِ ہستی' کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ ایک عرصے کے بعد ایک اوریجنل علمی و تاریخی کتاب پڑھنے کا موقع ملا۔ مصنف کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے کہ انھوں نے اس پیرانہ سالی میں ہمت وحوصلہ کے ساتھ دنیائے علم وادب کو ان تاریخی حالات و واقعات سے روشناس کرایا کہ اگر وہ نہ لکھتے تو ایک معتبر قلم کار کی علمی کاوش سے ہم محروم ہی رہتے۔ ہندوستان میں 'اردو صحافت' کی خدمات کے چرچے جنگ آزادی کے حوالے سے بہت ہوتے ہیں اور اس کی خدمات کو اجاگر کرتے ہوئے ہم رطب اللسان ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی ہے۔ لیکن آزاد ہندوستان میں 'اردو صحافت' کے زوال کے چشم دید داستان سنانے والے رضوان اللہ (فاروقی) شاید آخری شخص ہیں۔ کتاب کی زبان شستہ اور اندازِ پیش کش پُرکشش ہے۔ اپنی اس ضخیم آپ بیتی کو انھوں نے دیباچہ کے بعد صرف چار اوراق یا چار ابواب میں منقسم کیا ہے۔

'پہلا ورق' (صفحہ 19 تا 151) خاندانی پس منظر، ابتدائی حالات، تعلیم وتربیت

اور تلاش معاش کے ابتدائی مرحلے کو اجاگر کرتا ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ یہی عرصہ گزشتہ صدی میں برصغیر کا انتہائی انقلاب انگیز دور بھی تھا۔ اپنے نانیہالی گاؤں سمبھی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''کوئی چار پانچ گھرانے ایسے تھے جنھیں بالادستی حاصل تھی انہیں میں سے ایک بلکہ سب سے ممتاز گھرانا میرے نانا نانی کا تھا۔'' (صفحہ 37) ''انسانی قد و قامت کے اعتبار سے مسلمانوں کا طبقہ اشراف اور چھتریوں میں کافی مماثلتیں تھیں۔'' آگے لکھتے ہیں:

''مسلم آبادی کے قلب میں ایک اونچا چوکور چبوترہ تھا، جس کی لیپ پوت محرم کے قریب آتے ہی شروع ہوجاتی اور اس پر تعزیہ رکھا جاتا۔ مندر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کوئی مکتب، مدرسہ یا اسکول بھی نہیں تھا۔ قرآن اور ابتدائی اردو گھروں میں پڑھائی جاتی۔ ہمارے گھرانے میں ہماری ماں اس باب میں سب سے آگے تھیں، محلے کی لڑکیوں کو اور نہ معلوم کتنے لڑکوں کو بھی پڑھا کر فارغ کردیا......'' (صفحہ 36-37)

مصنف کا آبائی گاؤں یعنی دادیہال کوئریاپار ہے۔ سمبھی کی طرح یہ دور افتادہ گاؤں ضلع اعظم گڑھ کی تحصیل گھوسی میں واقع تھا اب نوتشکیل ضلع مئو میں شامل کردیا گیا ہے۔ (صفحہ 47) مصنف لکھتے ہیں: ''آزادی ملتے ہی سب سے پہلے جب یوپی میں زمینداری کے خاتمے کا قانون پاس ہوا تو زمینوں اور مکانوں پر ہر قابض اس کا قانونی مالک بن بیٹھا اور زمیندار اپنی ملکیت سے محروم ہوگیا۔ آزاد ہندوستان میں یہ پہلا امتیاز تھا جو قانونی طور پر نافذ کیا گیا۔ زمین داری دیہی علاقوں میں راتوں رات ختم کردی گئی جبکہ شہری علاقوں میں زمینوں اور جائدادوں کو تنسیخ زمینداری کے اس قانون سے بری رکھا گیا۔'' (صفحہ 51)۔ مصنف کی رشتہ داری آج کل (اردو) کے سابق ایڈیٹر محبوب الرحمٰن فاروقی (مرحوم) اور معروف نقاد و ادیب شمس الرحمٰن فاروقی (مرحوم) سے بھی تھی۔ مصنف کے والد مولوی سبحان اللہ (مرحوم) کے بڑے چچا زاد بھائی مولوی محمد اصغر کے سب سے چھوٹے بیٹے خلیل الرحمٰن فاروقی (ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس) تھے۔ انہی کے سات بیٹوں

میں شمس الرحمٰن فاروقی تھے۔ مولوی محمد اصغر گورکھپور گورنمنٹ نارمل اسکول میں ٹیچر تھے۔ انھوں فراق گورکھپوری کو بچپن میں اردو اور فارسی پڑھائی تھی۔ منشی پریم چند اور ان کے ہم عصروں میں تھے۔ (صفحہ 57-58)۔ مصنف کے بڑے دادا مولوی محمد عمر کی طبابت کا شہرہ دور دور تک تھا۔ صوبہ بہار کے شہر سمستی پور میں عرصہ دراز تک ان کا قیام رہا۔ وہ دربھنگہ مہاراج کے بھی خاص طبیب تھے۔

مصنف جولائی 1937 میں اپنے ماموں جان کے ساتھ کانپور پہنچے تھے۔ وہیں ان کا داخلہ فیض عام اسکول میں ہوا۔ اس اسکول میں فرسٹ ایڈ (First Aid) کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ (صفحہ 83) وہیں ان کی ملاقات نشؔور واحدی صاحب (و: جنوری 1983) سے ہوئی جو ایک مسجد میں پیش امام تھے۔ (صفحہ 85) بعد میں نشؔور واحدی درس و تدریس سے وابستہ ہوئے۔ بہترین شعراء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

مصنف نے 1939ء میں کانپور کے فساد کا مشاہدہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں: ''کانپور میں فسادات عام طور سے مول گنج کے چوراہے سے شروع ہوتے، جو ہندو آبادی او رمسلم آبادی کا نقطۂ اتصال یا خطِ تقسیم تھا۔ 1939 کے بعد ہر سال ہی فسادات ہوتے۔'' (صفحہ 91)۔ مصنف نے کانپور میں برہمنوں کے کالج 'کانیہ کبج' میں بھی تعلیم حاصل کی۔ وہاں مسلمان طلبا معدود چند تھے لیکن اردو اور فارسی تعلیم کا باقاعدہ انتظام تھا۔ فارسی کے کلاس میں پندرہ سولہ طلبا تھے اور اردو کے کلاس میں تقریباً چالیس۔ (صفحہ 102) مصنف کی زندگی کی ستم ظریفی ہے کہ ہائی اسکول سیکنڈ ڈویژن سے پاس کرتے ہی تلاش معاش کے لیے جون 1946 میں وہ عازمِ کلکتہ ہوئے۔ اس زمانے میں بنگال میں مسلم لیگ کی حکومت تھی اور حسین شہید سہروردی اس صوبے کے وزیراعظم تھے۔ (صفحہ 110)

مصنف 1946 میں کلکتہ پہنچے تھے اور پھل منڈی میں کام کیا تھا، لیکن ساتھ ہی تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے لیے ایک شفیق اور مہربان کی مدد سے ایک ایوننگ کالج میں ان

کا داخلہ بھی ہوگیا تھا۔ مصنف لکھتے ہیں کہ رمضان کی 18 تاریخ کو اگست کی 16 تاریخ تھی۔ جمعہ کا دن تھا۔ مسلم لیگ نے ڈائرکٹ ایکشن پلان کے تحت جلوسوں کا خاص اہتمام کیا تھا۔ پھر کیا تھا ایک فساد کی صورت پیدا ہوگئی اور جمعہ کی نماز کے وقت آگ کے شعلوں نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مسلم لیگ کے ترجمان روزنامہ 'عصر جدید' کے ایڈیٹر عبدالجبار وحیدی اپنے دفتر کی سیڑھیوں پر ہی نامعلوم گولی کا شکار ہوکر جاں بحق ہوگئے۔ (صفحہ 114) کوئی ہفتہ بھر سڑکوں پر پڑی ہوئی لاشوں کی کیفیت ایسی نہ تھی کہ کوئی انہیں اٹھاتا۔ چنانچہ فوجیوں کی نگرانی میں مردہ جانور ڈھونے والی گاڑیاں لائی گئیں اور کرین سے اٹھا اٹھا کر لاشیں ان میں لادی گئیں، پھر ان کا جو بھی حشر ہوا ہو۔ (صفحہ 119)۔

تبصرہ طویل ہوگیا ہے لیکن 15 سالہ رضوان اللہ کی چشم دید گواہی سے فسادات کے ہولناک مناظر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس ٹین ایجر کے قلب و ذہن کی کیا کیفیت رہی ہوگی۔ اسی باب میں قیام بنارس، ریلوے کی ملازمت اور دیگر دلچسپ واقعات بھی ہیں۔

کتاب کا دوسرا باب یا 'دوسرا ورق' (153 تا 284 صفحات) مصنف کی پیشہ ورانہ زندگی سے متعلق ہے جب وہ اردو صحافت سے منسلک ہوئے۔ مصنف کے بقول "اردو صحافت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا تھا اور اسے ڈھوئے پھر رہا تھا۔" مصنف نے اردو صحافت کو سرکاری ملازمتوں میں تاک جھانک کے بعد ہی اختیار کیا تھا جو بعد میں ان کی مجبوری بن گیا۔ اس باب میں صحافت کی تعریف اور ہندوستانی صحافت اور خود پر بیتی روداد کو جس طرح بیان کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے آزاد ہندوستان کے ارد واخبارات سے جو حسنِ ظن رکھا تھا وہ ایک ہی پل میں زمین بوس ہوگیا تھا۔ وہ 1951 میں پیشہ اردو صحافت سے وابستہ ہوئے اور 3 جولائی 1952 کو رشتہ ازدواج میں منسلک کردیے گئے۔ شادی کے آٹھ دس روز بعد پھر کلکتہ آ گئے۔ (صفحہ 175) وہ کلکتہ کے معروف اخبار

'عصرِ جدید' سے بحیثیت مترجم وابستہ ہوئے۔ اس کے مالک خان بہادر صاحب تھے جن کی عدالت میں ملازم کے Hiring اور Firing کا معاملہ لمحوں میں طے ہوتا تھا۔ مصنف نے 'آبشار' کلکتہ کے ایڈیٹر کی ایک عبارت یوں نقل کی ہے:

''اس زمانے میں اخبار میں کام کرنے والوں میں سب سے زیادہ خستہ اور قابلِ رحم حالت مترجمین کی ہوا کرتی تھی۔ وہ مترجم بڑا خوش نصیب سمجھا جاتا تھا جسے کبھی کبھی اپنی سرتوڑ خدمات کے معاوضہ میں کچھ رقم مل جایا کرتی ورنہ عموماً انھیں زیادہ تر مفت کام کرنا پڑتا تھا۔'' (صفحہ 160)

'آبشار' کے ایڈیٹر ابراہیم ہوش کے مضامین کا یہ سلسلہ 1983 میں روزنامہ 'اقرا' کلکتہ میں شائع ہوا۔ مصنف نے لکھا ہے کہ 'عصرِ جدید' کے مالک خان بہار شیخ محمد جان صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے لیکن ان کی 'عدالتِ عالیہ' لمحوں میں بڑی سفاکانہ فیصلہ کرتی تھی۔ مصنف اس اخبار سے اٹھارہ سال چپکے رہے لیکن ان کی خوش قسمتی تھی کہ کبھی اس 'عدالت' میں ان کی پیشی نہیں ہوئی۔ مصنف نے ایک لمبی فہرست سے کچھ نام درج کیے ہیں جن کو اس 'عدالت' میں جھٹکا کیا گیا۔ ان میں یونس احمر، خلیل عباس صدیقی، اسرائیل احمد، ش مظفر پوری، ولی اللہ، محمد عثمانی، اختر ملیح آبادی، حامد محمود نیازی، بسنت کمار چٹرجی، محمود راہی، وہاب اشرفی، سید ظفیر الحسن، سید محمد مصطفیٰ صابری، فاتح فرخ، رئیس جعفری، ناظر الحسینی، جاوید نہال، شہزاد منظر، محمود ایوبی، اقبال کلکتوی، شہاب لکھنوی، راز عظیم، شفیع نشاط، نیاز اعظمی، مطیع الرحمٰن، ادریس الحق، مشتاق احمد، سجاد نظر، بدر عالم نظامی وغیرہ شامل تھے۔ ان میں چند وہ اردو صحافی بھی تھے جو بعد میں اہم سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے۔ ان حضرات میں کئی ایسے بھی تھے جو ایک سے زیادہ 'عصر جدید' یا 'امروز' میں تقرر اور برطرفی کی لذتوں سے آشنا ہوئے۔ 'روزانہ ہند' اور 'آزاد ہند' اخبارات میں بھی ان کا تقرر ہو جاتا تھا لیکن مالکانہ اعتبار سے اردو صحافیوں کے ساتھ سبھوں کا رویہ کم و بیش ایک ہی جیسا تھا۔

انھوں نے اردو صحافت کے 'مالکانہ زوال' پر بہت کچھ لکھا ہے۔ تاہم مصنف کا یہ روح فرسا بیان قابلِ توجہ ہے:

''......چنانچہ جب میں اپنی صحافتی زندگی کے ابتدائی دور کا تصور کرتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں۔ حیران ہوکر سوچتا ہوں کہ مسلمان سرمایہ داروں نے اپنے ہونہار نوجوانوں کے ساتھ ایک ابتلا اور آزمائش کے دور میں جو سلوک روا رکھا کیا تاریخ میں کبھی کسی اور قوم کے صاحبِ ثروت طبقے نے ایسا کیا ہوگا! شاید نہیں!'' (صفحہ 159) شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے جرنلزم کا پوسٹ گریجویٹ کورس بھی کیا۔ جز وقتی طور پر یو ایس آئی ایس (امریکی انفارمیشن سروس) میں بھی کام شروع کر دیا۔ مصنف نے اپنی آپ بیتی میں جہاں اپنے چند صحافی دوستوں کے اخلاص اور مروت کا ذکر کیا ہے وہیں کلکتے میں جد وجہد سے پُر زندگی، قیام گاہ کی آزمائشیں اور 'عصر جدید' کی طرف سے زک پہنچانے کے پے در پے واقعات کی چشم کشا روداد بھی بیان کی ہے۔ مصنف چونکہ یو ایس آئی ایس سے بھی وابستہ تھے لہٰذا انھوں نے 'ڈپلومیٹک جرنلزم' لکھا ہے۔ بہت سی دشواریوں کے باوجود یہاں ان کو یک گونہ سکون محسوس ہوا۔ یہی وابستگی بعد میں مصنف کے پیشہ ورانہ کیریئر کا عروج ثابت ہوئی۔ پٹنہ میں امریکن لائبریری اور کلچرل سینٹر تھا جو یو ایس آئی ایس کلکتہ کے تحت کام کرتا تھا۔ وہاں غلام سرور صاحب (مالک و مدیر روزنامہ 'سنگم' اور سیاست داں) کے علاوہ پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ مظہر امام صاحب سے مصنف کی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ (صفحہ 243) عصر جدید میں کام کے دوران میں اگر چہ 'آزاد ہند' کے مدیر و مالک احمد سعید ملیح آبادی نے کئی بار 'آزاد ہند' سے منسلک ہونے کا اشارہ دیا تھا لیکن مصنف نے اسے لائق توجہ نہیں سمجھا۔ 1969 میں جب وہ 'عصرِ جدید' سے علاحدہ ہو گئے تو پھر احمد سعید ملیح آبادی نے ان کو پیغام دیا۔ پھر انھوں نے معذرت کی لیکن بعد میں کچھ عرصے کے لیے بوجوہ مصنف نے 'آزاد ہند' جوائن کرلیا اور ترجمہ کے ساتھ نیوز

ایڈیٹنگ کے کام کو ترجیح دی۔ (صفحہ 246)

'اخبارِ مشرق' کلکتہ اور دہلی کے مالک و مختار وسیم الحق صاحب ایک زمانے میں کلکتہ سے 'فلم ویکلی' نکالتے تھے۔ مصنف نے ان سے اپنے دیرینہ تعلق اور دوستی کا اظہار کیا ہے۔ جاوید نہال جن کا ذکر 'عصرِ جدید' کی عدالت میں جھٹکا کی فہرست میں آچکا ہے، مصنف نے لکھا ہے کہ وہ آگے چل کر کلکتہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے اور اردو کے ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ ہوئے۔ (صفحہ 248) مصنف نے یو ایس آئی ایس کے زیرِ اہتمام ملک کی کئی ریاستوں کی سیر کی جن میں آسام بھی شامل ہے۔ وہاں کی روداد بھی دلچسپ ہے۔ 22 نومبر 1963 کو جب صدر کینڈی کے قتل کی اطلاع ملی تو وہ دھنباد کے ایک ہوٹل میں ٹور پر تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب یو ایس آئی ایس کے انفارمیشن آفیسر پی ایف گولڈ کو یہ بات بتائی گئی تو انھوں نے ایک منٹ کی دعائیہ خاموشی کے بعد ہی اپنے ٹور پروگرام کو حسبِ منصوبہ جاری رکھنے کا اعلان کیا۔ مصنف لکھتے ہیں کہ صدر کینڈی کے قتل کے بعد امریکیوں کو کام دھندا بند کر کے بیٹھتے نہیں دیکھا بلکہ اور بھی سرگرم عمل پایا۔ مصنف کا خیال ہے کہ کسی قوم کو آگے لے جانے میں، طاقتور بنانے میں اور آسمان کی بلندیوں تک پہنچانے میں افراد کے اس کردار کو خاص دخل حاصل ہوتا ہے۔ (صفحہ 269)

اس باب میں 'اردو صحافت' کے زوال پر مصنف نے مزید بہت کچھ لکھا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ چند صفحات میں 488 صفحات کی کتاب کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ مصنف اسی باب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے برصغیر میں ایک عجیب ستم ظریفی اور بدقسمتی ہے کہ یہاں کے دانشور زیادہ فرقہ پرستانہ ذہنیت رکھتے ہیں خواہ وہ کسی مذہب یا علاقے سے تعلق رکھتے ہوں۔''
> (صفحہ 277)

اسی باب (دوسرے ورق) میں مصنف نے ذکر کیا ہے کہ یو ایس آئی ایس میں

کام کے دوران ابتدا میں ان کا نشانہ دہلی تھا۔ جب 27اگست 1975 کوکلکتہ میں یو ایس آئی ایس،نئی دہلی کے مسٹر میرین نے دہلی آفس کے اردو ایڈیٹر کے لیے رضوان اللہ (فاروقی) کوآفر دیا تو کچھ پس وپیش کے بعد انھوں نے ہامی بھر لی۔ اس طرح جون 1951 میں کلکتہ میں جس کیریئر کا انھوں نے انتخاب کیا تھا اس کا ڈراپ سین ہوگیا۔ دہلی میں ان کے کیریئر(Diplomatic Journalism) کا آغاز 7دسمبر 1975 کو ہوا۔ 24 سال کلکتہ میں پاپڑ بیلنے کے بعد جب وہ 30نومبر کی شام ہواڑہ اسٹیشن پر پَر تول رہے تھے تو الوداع کہنے کے لیے صرف ایک شخص بدر عالم نظامی آئے تھے۔ اس باب کے آخر میں مصنف لکھتے ہیں:

> ''اس مستقل ہجرت سے پہلے کوئی ایسی تقریب یا کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس سے یہ گمان گزرتا کہ کچھ لوگوں سے میری شناسائی بھی رہی ہے۔ میں دہلی آنے کے بعد اکثر سوچتا رہا یہ میری کمزوری تھی یا میرے حلقہ کی یا میرے ہم پیشہ لوگوں کی، یا یہ ایک بہت بڑے شہر کی سرد مہری تھی۔'' (صفحہ 284)

کتاب کا تیسرا باب یعنی تیسرا ورق 285 تا 426 صفحات پر مشتمل ہے۔ 'سفارتی صحافت' کا یہ باب ایک نئی دنیا سے متعارف کراتا ہے جو گزشتہ پیشہ ورانہ زندگی کا تسلسل ہے۔ اس میں ذاتی زندگی کی پیچیدگیاں بھی ہیں اور سفارتی نزاکتوں کے تقاضے بھی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ یہ سفارت کار صحافی باہر سے خواہ کیسے ہی نظر آئیں یا انہیں کیسے ہی رنگ میں پیش کیا جائے انھیں مفید کام انجام دینے کے بڑے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ لہٰذا صحافتی برادری کو ان سے تعاون کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ بالآخر 29 فروری 1992 کو رضوان اللہ (فاروقی) صاحب اپنی سفارتی صحافت سے ریٹائرڈ ہوگئے۔ اس موقع پر ان کو الوداعیہ دی گئی۔ 25 فروری کو امریکی سفیر ولیم کلارک نے اپنے دفتر میں عزت افزائی کی۔

کتاب کا چوتھا اور آخری باب (ورق) سفر وسیاحت ہے۔ یہ 'ورق' ان مقامات

کے بارے میں مصنف کے مشاہدات پر مبنی ہے جہاں ان کو جانے کا اتفاق ہوا۔ اس میں مصنف کے مشاہدات و تجربات کو یقینی طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی تقریباً تمام ریاستوں کے بڑے شہروں کا سفر کیا۔ بیرونِ ملک میں پاکستان بھی گئے۔ یوروپ اور امریکہ کے شہروں کی سیر بھی کی۔ تلخ و شیریں تجربات ہوئے لیکن ہر مرحلے پر نصرت ان کے حصے میں آئی۔

یہ خودنوشت سوانح بلاشبہ اس عہد کی تاریخ کا حصہ ہے جس میں مصنف نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور سخت سے سخت حالات میں بھی انھوں نے صبر واستقلال اور شکر کے ساتھ اپنے عزم واستقلال کو متزلزل نہیں ہونے دیا۔ اس خودنوشت آپ بیتی کی زبان میں سلاست اور سادگی ایسی ہے کہ قاری اگر آغاز کردے تو ختم کیے بغیر اسے تشفی نہ ہوگی۔

■❖■

اردو صحافت کا ایک اور ستارہ ڈوب گیا

عبدالعزیز، کلکتہ

اردو صحافت کا ایک اور ستارہ ڈوب گیا۔ رضوان اللہ بھی آج صبح دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ رضوان اللہ صاحب عظیم صحافی تھے، 'آزاد ہند' اور 'عصر جدید' کلکتہ میں برسوں کام کرتے رہے اداریے بھی لکھتے تھے۔ کلکتہ میں دس بیس سال صحافتی خدمات انجام دینے کے بعد دہلی چلے گئے، بہت دنوں تک امریکن سنٹر کے اردو میگزین میں بھی کام کرتے رہے۔ اردو زبان کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی مضامین لکھتے تھے۔ ڈاکٹر مقبول احمد صاحب کی کئی کتابوں کا انگریزی میں موصوف ہی نے ترجمہ کیا ہے۔ کئی اچھی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، کلکتہ کی اردو صحافت پر ان کی ایک کتاب ہے۔ چند ماہ پہلے موصوف نے اپنی آپ بیتی کتاب ''اوراقِ ہستی'' کی ایک کاپی عاجز کو اپنے گھر میں عنایت کی۔ ان کا ایک شعری مجموعہ بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ جب بھی ان کی کوئی کتاب شائع ہوتی خاکسار کو بھی از راہِ محبت عنایت فرماتے۔ بہت اچھے صحافی، ادیب، مصنف اور شاعر تھے۔ نہایت اچھے انسان بھی تھے۔ مشہور ادیب، نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی رضوان اللہ صاحب کے چچیرے بھتیجے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے آمین۔

■❖■

دہائیوں کا غائبانہ تعارف
چند برسوں کی ملاقات

عبدالسلام عاصم، نئی دہلی

رضوان اللہ فاروقی صاحب سے میں غائبانہ طور پر 1980 کی دہائی سے متعارف تھا۔ کلکتے میں اُن کا ذکر اپنے استاد صحافیوں سے راست طور پر سنتا رہتا تھا۔ اُن میں احمد سعید ملیح آبادی، سید منیر نیازی، رئیس احمد جعفری، سالک لکھنوی، ڈاکٹر جاوید نہال اور سجاد نظر کے نام نمایاں ہیں۔ ان مختلف الخیال متوفیان کی مشترکہ خوبی یہ تھی وہ جامد اتفاق پر متحرک اختلاف کو سماجی زندگی کے لیے صحت مند گردانتے تھے۔ رضوان صاحب سے متعلق بھی ان بزرگان کی مختلف آراء میں ایک رائے مشترکہ تھی۔ ان کے نزدیک رضوان صاحب سچ بولتے وقت نفع/نقصان نہیں دیکھتے تھے، خواہ نقصان سے بچنا مصلحت کا تقاضہ ہی کیوں نہ ہو۔

سال 1992 میرے اور رضوان صاحب کے درمیان بہ اندازِ دیگر مشترک ہے۔ اُس سال وہ جہاں امریکن سنٹر سے بحیثیت ایڈیٹر ریٹائر ہوئے، وہیں ان سے کسی قدر غیر آسان تعارف کے ساتھ میں دہلی آکر یو.این.آئی سے وابستہ ہوا۔ 2002ء یعنی دس

سال تک رضوان صاحب سے ملاقات کی نہ کوئی سبیل نکلی اور نہ ہی اپنی نیوکلیر فیملی کے ساتھ نئے شہر کی زندگی کے تقاضوں سے مانوس ہونے کی جدو جہد نے مجھے اس رخ پر کسی جستجو کی توفیق بخشی۔ تاج انکلیو میں کرائے کا فلیٹ تنخواہ میں سالانہ انکریمنٹ کی رفتار کے مقابلے میں سال بہ سال زیادہ تیزی سے مہنگا ہوتا گیا۔ کچھ ساتھیوں کے مشورے پر میں نے ابوالفضل انکلیو اور نئی بستی کے سنگم پر مغل اپارٹمنٹس کی سب سے پہلی بلڈنگ میں ایک فلیٹ خرید لیا۔ اُس زمانے میں وہاں تعمیرات بشمول تجاوزات پر جزوی پابندی لگی ہوئی تھی۔ اس لیے کوئی ایک سال بڑی حد تک آرام سے گزرا۔ مارننگ واک کے لیے ایک صاحب نے جماعت اسلامی کے صدر دفتر کا ایک ایسا حصہ دکھا دیا جو بہت موزوں تو نہیں لیکن کام چلانے کے لیے کافی تھا۔ وہاں دوسری یا تیسری صبح گاہی کے دوران ایکدم سے رضوان صاحب کا سامنا ہو گیا۔

میں نے انہیں اپنے ذہنی خاکے کی مدد سے پہچاننے کے بعد جب اپنا تعارف پیش کیا، تو انہوں نے دس سال تک ملاقات نہ ہونے پر اپنی حیرانی اس طرح ظاہر کی جیسے اُن سے مجھے نہیں، انہیں مجھ سے ملنا چاہیے تھا۔ اس رویے نے ان کے تعلق سے میرے ذہن میں موجود اس خاکے کو بکھیر کر رکھ دیا جو کلکتے میں بنا تھا۔ پھر ملاقاتوں کا سلسلہ ان کی رہائش گاہ تک دراز ہوا۔ میری اہلیہ ریحانہ فریدی سے جہاں وہ گھر کی باتیں زیادہ کرتے تھے، وہیں مجھ سے پیشے کے وابستگان، مہرباں/ نا مہرباں اخباری مالکان، مسلمان اور ان سے آباد علاقوں کے بحران پر بات ہوتی تھی۔ بیشتر حوالوں سے جہاں دونوں ہم خیال ہوتے تھے وہیں کچھ باتوں پر اختلاف بھی ہوتا تھا۔ ایسی ہی ایک گفتگو میں میری زبان سے ایک جملہ کیا پھسل گیا، وہ مجھے ملاقات کے اگلے کسی بھی موڑ پر سنبھلنے ہی نہیں دیتے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ ایک موضوعاتی بات چیت میں میری زبان سے یہ جملہ نکل گیا کہ اس پیشے میں آ کر ایک نقصان یہ ہوا ہے کہ جن لوگوں کی عزت کرتا تھا، اُن کے قریب بیٹھنے کا

موقع مل گیا اور۔۔۔۔۔۔'' اب تو وہ ہر ملاقات میں منجملہ اور باتوں کے یہ ضرور پوچھ لیا کرتے تھے کہ''۔۔۔نقصان کا دائرہ کتنا بڑھا'' اس سوال کا سلسلہ روکنے کا ایک دن میں نے اپنے طور پر مؤثر طریقہ نکال لیا جو کامیاب رہا۔ وہ طریقہ میرے جواب کے اِن چند الفاظ پر مشتمل تھا کہ'' آپ کا نمبر کبھی نہیں آئے گا۔''

اصل میں رضوان صاحب سے میری ملاقات اُس وقت ہوئی جب وہ حالات سے نبرد آزمائی کے ان مراحل سے گزر چکے تھے جن میں ایک سچا آدمی یا تو چھا جاتا ہے یا نقصان اٹھا کر ٹوٹ جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں تحریری طور پر کہیں کہیں دل کا غبار نکالا ہے۔ ممکن ہے اس سے بھی وابستگانِ صحافت و معاملت اتفاق نہ کریں۔ میں ان کی ایسی خال خال تحریروں سے اس احساس کے ساتھ گزرتا رہا کہ ضروری نہیں کہ جس ردِعمل سے فکری اتفاق نہ ہو، اُسے مسترد کر کے ہی آگے بڑھا جائے۔ رضوان صاحب مجموعی طور پر اچھے اور گوارا حد سے زیادہ حساس انسان تھے۔ شہرت سے زیادہ عزت کی تمنا رکھتے تھے، جس کی بلا شبہ تکمیل ہوئی ہے۔

چہل قدمی کے دوران بات چیت کی نوعیت یا بات مکمل کرنے کی چاہت انہیں جب بیٹھنے کے قابل کسی بھی جگہ پر بیٹھ کر اظہارِ خیال کرنے کی تحریک دیتی تھی تو میں لبیک سے کام لیتا تھا۔ پھر بات میں سے بات نکلتی چلی جاتی تھی۔ ایک مرحلے پر وہ یہ کہتے ہوئے اٹھتے تھے کہ آنا چلنا کم ہوا۔ یہ چلنا بھی عجب استعارہ ہے۔ چلتے چلتے لوگ جانے کہاں چلے جاتے ہیں۔ یقین سے پرے یہ معمہ بدستور لاینحل ہے۔ رہ گئی بات موت کی تو میرے نزدیک وہ لوگ کبھی نہیں مرتے جو اچھے تذکروں میں رہتے ہیں۔ رضوان صاحب بلاشبہ ایسے ہی لوگوں میں ہیں۔ ہم سماجی اور سیاسی زندگی کی کسی بھی بے ترتیبی پر جب بھی بات کریں گے ان کی باتیں یاد آئیں گی اور خیالات ذہن میں ابھریں گے۔

■❖■

رضوان اللہ فاروقی کے کلام کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر مغیث احمد
استاد شعبۂ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی، یوپی

اردو کے معروف صحافی، مشہور شاعر، کہنہ مشق ادیب اور متعدد کتابوں کے مترجم رضوان اللہ فاروقی سے میری ملاقات آج سے تقریباً بیس برس قبل ان کے گھر پر ہی ہوئی تھی، ان کی خوش مزاجی، خلوص، سادگی اور شہرت بیزاری کو دیکھ کر میں پہلی ملاقات میں ہی ان کا گرویدہ ہوگیا۔ پھر وہ دن تھا اور آج کا دن! ان بیس برسوں میں دہلی کی دوڑتی بھاگتی مصروف زندگی میں اگرچہ ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ بہت محدود رہا، لیکن باہمی خلوص میں کوئی کمی نہیں آئی، مجھے جب بھی ان کی یاد آئی، دن ہو کہ رات بلاتردد فون کردیا اور ادھر سے فون اٹھتے ہی جواب ملا، مغیث صاحب، ارے بھئی، دیکھئے میں کئی بار آپ کو فون کرنا چاہتا تھا، بات کرنے کے لیے بیٹھتا ہوں تو مدعا بھول جاتا ہوں اور مدعا یاد آتا ہے تو معلوم ہوا موبائل کسی دوسرے کمرے میں ہے، بھئی کیا کریں ضعیفی ہے، ذہن سے بات نکل جاتی ہے اور اب تو چلنا پھرنا بھی مشکل ہوگیا ہے، ان تمہیدی باتوں کے ساتھ مزید باتوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا۔ اسی طرح جب انھیں میری ضرورت محسوس ہوتی تو فون سے بات کرکے اپنا مدعا بیان کردیتے اور کبھی ضرورت ہوتی تو ناچیز کو گھر پر ہی بلالیتے اور مجھ

سے جو بھی بن پڑتا حتی الوسع پورا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔اس وقت رضوان اللہ فاروقی سے جڑی بہت سی یادیں ذہن میں گردش کررہی ہیں جو انشاء اللہ کسی اور موقع پر تفصیل سے تحریر کی جائیں گی۔ سردست ان کی تحریروں اور مختلف زبانوں میں موجود ان کے کلام پر گفتگو کرنی ہے۔

رضوان اللہ فاروقی کا آبائی وطن اترپردیش کا مردم خیز خطہ اعظم گڑھ تھا۔ ۱۵ر جولائی ۱۹۳۱ء کو اپنے ننیہال 'سمبھی' اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے، والد کا نام مولوی سبحان اللہ تھا۔ ابھی ایک سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ والدہ سانپ کے کاٹنے سے چل بسیں، بچپن نانی جان کے آغوش الفت میں گزارا، ۱۹۳۸ء میں ماموں جان مولوی حفیظ الرحمٰن ایمن شہابی نے جیسے تیسے تعلیم و تربیت کا بیڑا اٹھایا اور مدرسہ فیض عام کانپور میں داخلہ کرادیا، جہاں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر ۱۹۴۶ء میں کے کے کالج کانپور سے میٹرک پاس کیا اور پھر مالی تنگی کے باعث ملازمت کی تگ و دو میں مصروف ہوگئے، کچھ عرصہ دیوریا میں ضلع سپلائی آفس میں کام کیا، پھر بنارس میں ریلوے ڈرائیور کے طور پر سینہ سوزی کی۔ اس دوران اپنا تعلیمی سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ۱۹۵۱ء میں چرچ کالج کانپور سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور پھر اسی سال کلکتہ میں روزنامہ 'عصر جدید' سے اپنے صحافتی پیشے کا آغاز کیا، لیکن مشاہرہ اتنا کم تھا کہ بمشکل اخراجات پورے ہوتے تھے، اس لیے مزید کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہے، ۱۹۵۶ء میں دوران ملازمت ہی کلکتہ یونیورسٹی سے جرنلزم سے ایم اے کیا، جس کے بعد ۱۹۵۷ء میں کلکتہ میں واقع امریکی سفارت خانہ کے دفتر یو ایس آئی ایس میں پارٹ ٹائم ملازمت مل گئی جو ۱۹۷۵ء تک جاری رہی، اس جز وقتی ملازمت سے ان کے مالی مسائل میں بہت حد تک بہتری آگئی۔مگر اس دوران 'عصر جدید' کے دفتری شرائط اور نوکری کی نزاکتوں کی تاب نہ لاکر ۱۹۶۹ء میں استعفیٰ دے دیا، جس کے بعد اردو کے معروف صحافی احمد سعید ملیح آبادی کے روزنامہ ''آزاد ہند'' سے

وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۷۵ء میں انھیں دہلی میں واقع امریکی سفارتخانہ کے انفارمیشن سینٹر میں اردو کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے منتخب کرلیا گیا، لہذا کلکتہ کو خیرآباد کہہ کر وہ دہلی چلے آئے اور پھر یہیں سے ۱۹۹۲ء میں وہ اپنے صحافتی پیشے سے سبکدوش ہوئے۔ تب سے تاحیات وہ مسلسل لکھنے پڑھنے کے عمل میں مصروف رہے۔

۲۰۰۳ء میں امریکی سفارت خانے سے جاری ہونے والے اردو جریدہ 'اسپین' سے بحیثیت مترجم وابستہ ہوئے اور تقریباً پونے تین سو مضامین کا ترجمہ کیا۔ کئی برسوں تک پندرہ روزہ ملی گزٹ میں کالم نویس کی حیثیت سے سرگرم رہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں اور متعدد کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ان کے درجنوں مضامین ملک کے مختلف روزناموں، ادبی مجلوں اور ویب سائٹس پر شائع ہوتے رہے۔ رضوان اللہ فاروقی اپنی کتاب ''اوراقِ ہستی'' میں لکھتے ہیں:

> ''۱۹۹۲ء کے بعد کسی وقت بازدید حیات کا سلسلہ موقوف کرکے اس کو طاق نسیاں کے حوالے کردیا تھا پھر دوسرے کاموں میں لگ گیا۔ چار کتابوں کا انگریزی سے اردو میں چار کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرڈالا۔ اخبارات و رسالوں میں مضامین لکھنے لگا کہ یہ مرض کافی پرانا تھا، کوئی پونے تین سو مضامین لکھ ڈالے۔ انگریزی رسالہ ملی گزٹ نکلا تو ایک کالم کے ساتھ اس میں شریک ہوگیا اور اگلے تین چار برسوں میں تقریباً ایک سو مضامین لکھ ڈالے، اللہ رزاق ہے، میرے قلم کے لیے ایک نئی غذا فراہم کی۔ امریکی سفارت خانے کا مایہ ناز مجلّہ اسپین کا اردو ایڈیشن جاری ہوا تو اس کے لیے کوئی چار برسوں میں گن کر ۲۷۲ مضامین کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرڈالا۔ پھر تصنیفات کا عارضہ لاحق ہوگیا اور ''بے ادبیات'' (۲۰۰۰ء)، ''اوراق مصور (۲۰۰۲ء)، ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' (۲۰۰۶ء)، ''متاعِ سحر'' (۲۰۰۸ء)، ''ہمارے گاؤں ہمارے لوگ'' (۲۰۱۱ء)، My Reflection (۲۰۱۳ء) اور کافی

وقفے کے بعد اب اس پوتھی کو اٹھایا ہے، لیکن اس دوران خاموش نہیں بیٹھا۔ خلا میں جست لگائی اور ایک Blog کھول دیا۔ اس میں اناپ شناپ کچھ بھی بھرتا گیا۔ اس سے بھی آسودگی نہیں ہوئی تو www.rizwanullah.com کے عنوان سے ایک سائٹ ۲۰۱۵ء میں کھول دی جو بحمدللہ اب تک کھلی ہوئی ہے۔''

(اوراق ہستی، ص-۱۵-۱۴)

رضوان اللہ فاروقی کی پوری زندگی مصائب و مشکلات سے لوہا لیتے گزری، اگرچہ اعظم گڑھ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن گذشتہ چار دہائیوں سے بھی زیادہ عرصہ سے وہ دہلی میں مقیم تھے۔کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی، نواسوں کے سہارے زندگی کی آمد و رفت ہوتی رہی، تین سال قبل برسوں سے بیمار ان کی اہلیہ داغ مفارقت دے گئیں، پھراس کے ایک سال بعدان کی پانچ صاحبزادیوں میں سے چوتھی صاحبزادی نے الوداع کہہ دیا، ان کے سب سے چھوٹے بھائی پروفیسر فیضان اللہ فاروقی جو جے این یو کے شعبہ عربی سے سبکدوش ہوئے تھے، ۲۰۲۰ء میں کورونا کی زد میں آ کر فوت ہوگئے۔ دسمبر ۲۰۲۰ء میں ہی ان کے چچازاد برادرزادے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کورونا کی نذر ہوکر چل بسے۔اس پیرسالگی اور ضعیفی کے عالم میں اتنے سارے مصائب و مشکلات سے دوچار رہنے کے باوجود ۲۰۲۰ء میں ۴۸۸ صفحات پر مشتمل اپنی خودنوشت سوانح مرتب کر کے منظرعام پر لے آئے، جو یقیناً غیرمعمولی عمل تھا۔جیسا کہ رضوان اللہ فاروقی خود رقمطراز ہیں:

''گزشتہ سال کے اواخر میں اہلیہ کی طویل علالت کے بعد وفات ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! ابھی یہ زخم تازہ ہی تھا کہ چند ماہ قبل میرے چھوٹے بھائی پروفیسر فیضان اللہ فاروقی کی مختصر علالت کے بعد وفات ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!۔ ان محرومیوں کو لفظوں میں نہیں بیان کرسکتا۔ اب اپنی تمام کمزوریوں کے ساتھ ایک قیدِ تنہائی ہے۔ دیکھئے اب اس تھکے ہارے مسافر کی شکستہ کشتی کو بادحوادث کے

تھپیڑے کب اور کہاں کنارے لگاتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔''

(اوراق ہستی، ص-۱۵)

چند مہینوں قبل دہلی میں جب رضوان اللہ فاروقی سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات ہوئی تو بہت نحیف نظر آئے، لیکن ملاقات کے بعد چہرے پر وہی شگفتگی، وہی بشاشت اورخوش مزاجی دکھائی دی جو پہلے نظر آتی تھی۔ایسا لگا جیسے گھنٹوں سے انتظار میں بیٹھے ہوں۔مگر ان سب کے باوجود ان کے اندرون کا درد بخوبی محسوس کیا جاسکتا تھا، بقول رضوان اللہ فاروقی:

بہت چاہا کہ حال دل کبھی کوئی نہ سن پائے مگر کمبخت آنکھوں نے خموشی میں زباں رکھ دی
مٹادی اپنی ہستی پھر بھی دنیا کچھ نہ دے پائی جبیں مجھ کو کہاں رکھنی تھی اور میں نے کہاں رکھ دی

(متاع سحر، ص-۱۰۷)

رضوان اللہ فاروقی کی شاعری میں وسیع النظری ہے، انھوں نے اپنے اندرون میں اٹھ رہے جذبات واحساسات کے طوفان کو بڑی مہارت سے لفظوں کا پیرہن عطا کیا ہے، وہ ایک جگہ کہتے ہیں:

تکتا رہتا ہوں دیر تک اس کو جس کا چہرہ کسی سے ملتا ہے
لے کے جائے جہاں بھی مجبوری کون کس سے خوشی سے ملتا ہے
کون ہم سا ہے بے نوا رضواں کون اس عاجزی سے ملتا ہے

(عکس خیال، ص-۹۵)

انتقال سے چند روز قبل رضوان اللہ فاروقی کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ڈاکٹر زہرا صاحبہ نے ان کی نئی کتاب ''تبصرات کتب'' کی سافٹ کاپی واٹس ایپ کیا، بہت خوشی ہوئی، انہی کی معرفت غائبانہ سلام اور مبارکباد پیش کیا اور ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ فون کر کے ان کی احوال پرسی کروں گا اور نئی کتاب کی آمد پرانھیں مبارکباد بھی پیش کروں گا،

مگر ۱۸ اکتوبر ہفتہ کے روز فیس بک پر ان کے انتقال کی خبر گردش کرتے ہوئے دیکھا تو دل مسوس کر رہ گیا۔ آخر انسان کے بس میں بھلا ہے بھی کیا؟ موت تو برحق ہے، بقول مرزا شوق لکھنوی:

موت سے کس کو رستگاری ہے　　آج وہ، کل ہماری باری ہے

آتش نے بجا ہی کہا ہے:

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں　　روئیے کس کے لیے کس کس کا ماتم کیجیے

رضوان اللہ فاروقی ایک ایماندار، خوددار، خوش خلق اور نیک صفت انسان تھے، صوم وصلوۃ کے پابند ایک سچے عاشق رسول اور خداترس تھے۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے، منکسرالمزاجی جیسے ان کی جبلت میں شامل تھی۔ معاملات کے بڑے کھرے تھے، اپنا نقصان برداشت کر لیتے مگر صاحب معاملہ کو کبھی مایوس نہیں کرتے تھے۔ عہد حاضر میں ان جیسے لوگوں کا تصور ہی کیا جاسکتا ہے، عملی طور پر ملنا تو بہت مشکل ہے۔ ان کے پاس بیٹھ کر دل کو سکون ملتا تھا، جو ایک نیک صفت انسان کی پہچان ہوتی ہے۔ ان کی باتیں بڑی ظریفانہ ہوتی تھیں۔ گھنٹوں باتیں کریں مگر کبھی بوریت کا احساس نہ ہوتا تھا۔ بقول سرور بارہ بنکوی:

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہوجائے وہ لوگ　　آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

رضوان اللہ فاروقی راست گو، بے باک اور بے لاگ صحافی تھے۔ اصول پسندی ان کی سرشت میں شامل تھی۔ محفل کے ہنگاموں سے دور رہ کر علمی کام کرنے اور اپنے کام سے کام رکھنے والے شخص تھے۔ بقول پروفیسر شمیم حنفی: ''رضوان صاحب ایک گوشہ گیر، شہرت اور توجہ کی دھوپ سے گھبرانے والے، کہنہ مشق صحافی ہیں۔ ان کی صلاحیتوں کے نقوش پچھلے پچاس برسوں کی اردو صحافت پر ثبت ہیں۔'' (بے ادبیات، ص-۱۱)

رضوان اللہ فاروقی نے ایک طویل عمر پائی اور خاصے علمی و ادبی سرمائے

چھوڑے۔ مضامین لکھے، مقالے تیار کیے، تراجم سے شغف رکھا، ادبی شہ پارے رقم کیے اور شاعری میں گرانقدر کارنامہ انجام دیا۔انھیں اردو، فارسی اور انگریزی پر یکساں عبور حاصل تھا اور تینوں زبانوں میں خوب لکھا اور خاصا لکھا۔ اردو اور فارسی ہر دوزبانوں میں شاعری کی اور دل کو چھو لینے والے بہترین نمونے چھوڑے۔

رضوان اللہ فاروقی کی منظوم و منثور کتابوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے، جن میں کچھ اردو میں ہیں تو کچھ انگریزی میں اور کچھ کتابیں دوسری کتابوں کے انگریزی یا اردو تراجم ہیں۔قارئین کی سہولت کے لیے ذیل میں ان کی کتابوں کی تفصیل دی جارہی ہے:

اردو کتابیں

۱- بے ادبیات،۲۰۰۰ء

''بے ادبیات'' دراصل رضوان اللہ فاروقی کی طنزیہ ومزاحیہ نثری کتاب ہے۔ اس کتاب کی وجہ تالیف کے تعلق سے مصنف خود اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''۱۹۹۲ء میں جب میں ریٹائر ہوا تو لکھنے لکھانے کا مرض چالیس برس پرانا ہو چکا تھا، ظاہر ہے اتنا پرانا مرض جیتے جی تو چھوٹ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ چند ماہ ذہنی خلا یا گمشدگی کے عالم میں رہنے کے بعد حواس بجا ہوئے تو سوچا لاؤ قلم کی روانی کی آزمائش کریں۔طنز ومزاح کی ڈگر اس خیال سے پکڑی کہ اس میں فکری اور زبانی ہر طرح کی بے راہ روی کھپ جائے گی۔ اعتماد کچھ اور بحال ہوا تو کوئی کالم لکھنے کا خیال آیا، اس کے لیے 'پس چہ باید کرد' کا عنوان تجویز کیا اور اس کے تحت ہفتہ وار مضامین روزنامہ 'آزاد ہند' اور 'روزنامہ اخبار مشرق کلکتہ' کا انتخاب کیا۔ میری خوش قسمتی سے اس کا دہلی ایڈیشن شائع ہونے لگا تھا اور کچھ مروتیں بھی کام آئیں، چنانچہ نظم ونثر میں جو کچھ قلم سے سرزد ہوتا رہا،

قومی آواز کے حوالے کرتا رہا۔

کچھ عرض گزر جانے کے بعد جو شائع شدہ مواد اکٹھا ہوا اس کے دباؤ کی وجہ سے جو چلبلی پیدا ہوئی اس نے کسی تصنیف کے خیال کو راہ دی اور اس خیال نے ساری خرافات کی چھان پھٹک کے بعد ایک انتخاب اور پھر نثر و نظم کے دوحصوں میں اس کی تقسیم کی صورت گری کی۔ شکر ہے ایسے میں پاسبان عقل نے دل کو تنہا نہیں چھوڑا اور اس کو اپنا دامن تھمائے رکھا، چنانچہ نثر و نظم میں دو الگ الگ تصنیفات کے ضیق سے بچ گیا۔ ایک تصنیف کا فائدہ یہ ہوا کہ دہلی اردو اکادمی کی چھتری بھی آسانی سے مل گئی۔ یہ تو رہا اس تصنیف کا سبب۔'' (بے ادبیات، ص-۴)

۲- اوراق مصور۲۰۰۲ء

''اوراق مصور'' رضوان اللہ فاروقی کی شعری شاہکار ہے، جو ایک طویل مثنوی اور کچھ نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے اشعار کے ذریعہ اپنے جذبات و احساسات کی ایک فنکارانہ مہارت کے ساتھ تصویر کشی کی ہے۔ اس کتاب کے تعلق سے پروفیسر شمیم حنفی لکھتے ہیں:

> ''خوبی کی بات یہ ہے کہ سیدھے سادھے، بظاہر بے رنگ بیان کے دوران کہیں کہیں غیر معمولی تخلیقی استعداد اور ادراک کے شرارے بھی چمک اٹھتے ہیں اور ایسے اشعار بھی سامنے آجاتے ہیں جن میں خیال کے ساتھ ساتھ شاعری کا بے پایاں لطف بھی موجود ہے۔'' (اوراق مصور، ص-۸)

۳- کلکتہ، اردو صحافت اور میں ۲۰۰۶ء

رضوان اللہ فاروقی نے اس کتاب میں کلکتہ میں اپنے تقریبا پچیس سالہ صحافتی روز و شب کی روداد مرتب کردی ہے جس کے ضمن میں اردو صحافت، پریس کے مالکان، ایڈیٹر صاحبان اور صحافت پیشے سے وابستہ ملازمین کے عمومی حالات کی پوری عکاسی ہوتی

ہے۔ جیسا کہ خود رضوان اللہ فاروقی ''کلکتہ، اردو صحافت اور میں'' کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

> ''ہمارے اردو اخباروں کی ظاہری ہیئت سب پر آشکار ہے۔ پھر یاد دلادوں کہ فی الحال میرے پیش نظر کلکتہ کے اردو اخبارات ہیں، گوتذکرے کا انداز عمومی ہے، یوں اس تخصیص اور عمومیت کے درمیان کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔''
>
> (کلکتہ، اردو صحافت اور میں، ص-۱۰)

۴- متاعِ سحر ۲۰۰۸ء

رضوان اللہ فاروقی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے، اس میں ان کی پابند اور معرا ہر طرح کی نظمیں موجود ہیں۔ یہ مجموعہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں رضوان اللہ فاروقی کا اردو کلام ہے جب کہ دوسرے حصہ میں ان کا فارسی کلام شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے۔ حمد اردو میں ہے جب کہ نعتیہ کلام فارسی زبان میں ہے۔ اردو نظموں میں عبادت، کام، فغاں اے افغاناں فغاں، زندگی اور سیاست نامہ وغیرہ جبکہ فارسی نظموں میں تقدیم، خضر و موسیٰ، در بیان علم، کشش و انتشار اور مدحت محبوب وغیرہ شامل ہیں۔

۵- ہمارے گاؤں، ہمارے لوگ ۲۰۱۱ء

اس کتاب میں دراصل مصنف کے ابتدائی ایام زندگی کی جھلکیاں ہیں۔ مصنف نے اس کتاب کے ذریعہ از راہ تشکر و امتنان اپنے گاؤں کے کچھ مخلص اور جہاں دیدہ منکرو، شیخ سعید اللہ جیسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کی صحبت میں بیٹھ کر بہت کچھ سیکھنے اور زندگی کے اوراق کو دقیق نظروں سے پڑھنے کا شعور حاصل کیا ہے۔ یاد ماضی کی اس داستان میں اہل علم اور صاحب فضل و کمال کے علاوہ سمیع اللہ، غلام ربانی، محمد اور جمیل جیسے دوستوں کے بہت سے کردار بھی شامل ہیں جن کے ساتھ آم اور جامن کے موسم میں باغوں کا

چکرلگانے، گلی ڈنڈا، کبڈی اور مچھلی کا شکار کرنے کا موقع فراہم ہوا ہے۔ کتاب کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے کہ پڑھنے پر ذہن ایک لمحہ کے لیے گاؤں کی بھولی بھالی زندگی میں کھوجاتا ہے۔

۶-عکس خیال۲۰۱۳ء

یہ کتاب دراصل رضوان اللہ فاروقی کے منتخب کلام کا انگریزی ترجمہ ہے، جسے مصنف نے خودانجام دیا ہے۔ ''عکس خیال'' کو مصنف نے انگریزی زبان میں "My Reflections" کے نام سے متعارف کرایا ہے۔

۷-اوراق ہستی ۲۰۲۰ء

''اوراق ہستی'' رضوان اللہ فاروقی کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو چار ابواب میں منقسم کیا ہے اور ہر باب کو ایک ورق سے تعبیر کیا ہے۔ پہلا ورق مصنف کے خاندانی پس منظر، ابتدائی حالات زندگی، تعلیم وتربیت اور تلاش معاش کے ابتدائی ایام پر مکمل ہوتا ہے، دوسرا ورق مصنف کے پیشہ ورانہ زندگی کے حالات سے متعلق ہے، تیسرا ورق مصنف کے پیشہ ورانہ اور ذاتی زندگی کا آمیزہ ہے، جب کہ چوتھا ورق مصنف کے سیروسیاحت اور ذاتی مشاہدات سے متعلق ہے، جس میں ضمنی طور پر ان مقامات کا ذکر ہے، جودوران سفر مصنف کی دلچسپی کا باعث بنے اور توجہ مبذول کرسکے۔ ''اوراق ہستی'' کے تعلق راقم کا تفصیلی مضمون رضوان اللہ فاروقی کی آخری کتاب ''تبصرات کتب'' میں شامل ہے۔

۸-تبصرات کتب۲۰۲۲ء

''تبصرات کتب'' رضوان اللہ فاروقی کی مرتب کردہ کتاب ہے جس میں انھوں نے مختلف تبصروں کو جمع کیا ہے، یہ تبصرے دوطرح کے ہیں، کچھ تبصرے ایسے ہیں جوان کی

مختلف کتابوں پر لکھے گئے ہیں، جب کہ کچھ تبصرے خود رضوان اللہ فاروقی کے ہیں، جو انھوں نے مختلف کتابوں پر رقم فرمائے ہیں۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ رضوان اللہ فاروقی کی کئی دیگر کتابیں بھی ہیں جو انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ جن کی فہرست اس طرح ہے:

انگریزی کتابیں

۱- ربا کیا ہے؟ [What is Reba?]

۲- نشیب وفراز [Ups and Downs]

۳- مضامین مقبول [Maqbool's Dissertations]

۴- صدائے جرس [The Clarion Call]

۵- Four Books of Computer Course

۶- Urdu Self Tought

علاوہ ازیں رضوان اللہ فاروقی کے اردو میں ڈھیروں مضامین ہیں جو مختلف مواقع پر متعدد مجلّات اور روزناموں میں شائع ہوتے رہے ہیں، جن میں کچھ اہم مضامین کے عنوانات جیسے 'قومی آواز، باز دید حرم، اوراق ہستی ایک مطالعہ، صدیقی سسٹرس کی کہانیاں اور پس منظر، حجاب اسلامی کا خصوصی شمارہ: فیملی کونسلنگ، لمعات نصیری-تذکرہ مولوی سعید محمد نصیر، آسمان فاروقی کی کہکشاں، حجاب اسلامی، اسپین میگزین، نقش ثانی، اعظم گڑھ انسائیکلوپیڈیا، خواتین کی خودنوشت سوانح عمری، اردو میڈیا زندہ باد، جہان فارس کی نشاۃ ثانیہ، گاہے گاہے بازخواں، برسبیل تذکرہ، کتب صحافت کی باز دید، درد پرانے جاگ اٹھے، مسلمانوں کے لیے مغربی بنگال میں تیسرا تجربہ، اردو صحافت احتجاج کی آواز، ایک قومی زمینی پالیسی ضروری ہے، گود لے لو، اردو زبان کا مذہب سے سروکار، اقوام عالم کے قبلہ نیویارک میں، شکاگو میں دانشوروں کے درمیان، کرپشن کا واویلا، دوسری زبانوں میں اردو ادب کے ترجمے کی ضرورت

اور اہمیت، الیکشن تو الٰہی بار بار آئے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح رضوان اللہ فاروقی کے انگریزی مضامین کی بھی ایک لمبی فہرست ہے ، برسبیل تذکرہ کچھ مضامین کے عنوانات ذیل میں ذکر کیے جارہیں ہیں:

Biographical Encyclopedia of Indian Muslim Freedom Fighters: A review, Role of Ulama in the Freedom Movement, Contribution of Indian Muslims to the Independence Movement, Post Script - Muslim Freedom Fighter (Book Review), Two Centuries of Urdu Journalism, My Reflections, Accountability in Practice, Science Confirms the Faith, The Sense of Accountability Promotes Piety, Unite for a Noble Cause, Growing the Beard.

مذکورہ بالا سبھی مضامین اور کتابی مواد رضوان اللہ فاروقی کی بلاگ rizwanullah.com پر دستیاب ہے، جو مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

شاعری

شاعر کا کلام کیا ہوتا ہے، دراصل اس کی زندگی کا عکس ہوتا ہے، وہ جن مقامات سے گزرتا ہے، جن چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے یا جن حالات سے دوچار ہوتا ہے، اسی کو اپنی شاعری میں سموکر اسے زندہ جاوید بنا دیتا ہے۔رضوان اللہ فاروقی نے بھی جن چیزوں کو دیکھا، برتا یا مشاہدہ کیا، انہی کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے، ان کی شاعری میں مادر وطن کے تاریخی کھنڈرات بھی ملیں گے، یہاں کے مساجد و مقابر اور معابد بھی دکھائی دیں گے، یہاں کے دریا، موجیں، محلات، باغات اور قلعے بھی نظر آئیں گے۔ یہاں کے میلے ٹھیلے، درگا پوجا، اشنان اور گنگا کی لہریں دکھائی دیں گی، یہاں کے شاہی جاہ وجلال، لشکرو سپاہ، چرند و پرند، صوفی سنت اور ان سب کے درمیان خود اپنی زندگی سے جوجھتے لمحات

سب کچھ نظر آئیں گے۔ رضوان اللہ فاروقی کے شاعرانہ کمال پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی رقمطراز ہیں:

> ''رضوان صاحب کا تعلق ایک علم دوست گھرانے سے ہے، مشرقی یوپی کے گمنام قصبات کا ایک امتیاز جو انہیں معروف وممتاز شہروں کے برابر کی حیثیت دیتا ہے، ان میں صدیوں کی پروردہ، نمو پذیر اور زندہ علمی اور ادبی روایتیں۔ رضوان صاحب کے شعور میں جو وسعت، نظر میں جو گہرائی اور زبان و بیان میں جو غیر معمولی ذہانت وشائستگی جھلکتی ہے، انہی روایتوں کا عطیہ ہے۔'' (اوراق مصور، ص-۲)

رضوان اللہ فاروقی نے اپنے زاد بوم اول پر 'سمبھی نامہ' کے عنوان ایک طویل نظم لکھی ہے، جس میں انھوں نے اس علاقے، یہاں کے لوگ، یہاں کی گلیاں، سڑکیں، ندی اور نالے اور ان سے وابستہ اپنی یادوں کے حسین احساس کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے، بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

محبت کے مارے تھے سمبھی کے لوگ — وہی سب کا دارو وہی سب کا روگ
محبت کا پیکر تھا ہر خاص و عام — کہوں سچ، مروت تھی ان پر تمام
غنی دل کے تھے اور سادہ مزاج — بنائے ہوئے اک مثالی سماج
بڑے محنتی دھن کے پکے تھے لوگ — بہت سادہ دل اور سچے تھے لوگ
بزرگ ایک آئے تھے قاضی شہاب — وہی ان کے مورث تھے عالی جناب
انہی سے ملے نسب و نام و نشاں — انہی کے قبیلے کے اشراف یاں
مری مہد سمبھی محبت تری — دل و جاں سے لپٹی ہے چاہت تری
تصور میں تصویر تیری سدا — کچھ ایسی کہ دل اس پہ میرا فدا
تیری دھول سر اور منھ پر ملے — گلی اور کوچے میں پھرتے رہے
کہیں تاڑ کے پیڑ جیسے سپاہ — زمیں پر قدم آسماں پر نگاہ

اگر قد و قامت سراپا سیاہ — سروں پر زمرد کی رکھے کلاہ
اناجوں کے کھیتوں میں کیا لہلہے — ہر اک بالی اپنی کہانی لیے
کہیں بال بھٹے کی رانی لگے — سنہری سی زلفیں بکھیرے ہوئے
مہک سوندھی سوندھی ہے کھلیان کی — وہی چیت آنے کی پہچان بھی
زمانہ ہے چیتی کا گھر گھر کی عید — کسانوں کے گھر میں ہے گھر بھر کی عید
دکانیں مٹھائی کی، لڈو لدے — امرتی، بتاشے کے ڈالے سجے
چھٹا ہم سے سمبھی جوں ناخن چھٹے — بیاں کس طرح ہو کلیجہ ہلے
جو آنکھوں سے جاری ہوئے آبشار — تو سینے میں چنگاریوں کی پھوار
چلے تیرتے آنسوؤں میں چلے — وہ نالے تھے جن سے گلے ہم ملے
وہی گرد سمبھی کی لیکن اڑی — سفر میں بگولوں کے شامل ہوئی
جو ذرہ تھا وہ شعلہ خود بن گیا — جو قطرہ تھا خود آب جو بن گیا

(ہمارے گاؤں ہمارے لوگ، ص-۱۴۶)

رضوان اللہ فاروقی نے کلکتہ میں ایک طویل عرصہ تک قیام فرمایا، وہاں پر اپنے خوشی وغم کے لمحات گزارے، یہاں کے سرد وگرم کو برداشت کیا، یہاں کے بہاروخزاں کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ آزادی کی کھوکھلی خوشی کے بطن سے تقسیم وطن کے عفریت کو یہیں پر اپنی نظروں سے دیکھا، بنگال کے فسادات کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا اور وہاں کی قحط سالی کی مار بھی جھیلے، اتنی مدت میں شہر کلکتہ جیسے ان کی خوشی وغم کا ساتھی اور ہمراز بن گیا، پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب اسی کلکتہ کو الوداع بھی کہنا پڑا۔ ان سبھی حالات سے متاثر ہوکر شہر کلکتہ کو ہمیشہ آباد رہنے اور بڑا سے بڑا شہر ہونے کی دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں:

قیدی تھا شہر حسن کا بیمار ہوگیا — یا یوں کہیں کہ عشق کا آزار ہوگیا

پہلے پڑا تھا پاؤں میں زنجیرِ معاش　پھر راس آئی شہر میں برسوں کی بود و باش
عزت مآب کلکتہ، شہر عزیز ہے　محفل میں جس کی شمع محبت کنیز ہے
چہرے پہ گرد شہر کی، عطر حیات تھی　غرق عرق حیات کی راہ نجات تھی
ایسے میں چاہیے کہ کتاب دعا لکھے　کرکے سلام کہہ دے کہ 'اے کلکتہ چلے!'
میرے خیال و خواب کی دنیا تجھے سلام　محبوب میرے صبح تماشا تجھے سلام
پھولے پھلے ہمیشہ تو ایسی ہوا چلے　گرد سفر سے پاک ہو چہرہ خدا کرے
دنیا میں تیرا نام بھی روشن سدا رہے　سب سے بڑا جو شہر ہو، اس سے بڑا رہے

(عکس خیال، ص-۱۱-۱۰۵)

شہر کلکتہ سے رضوان اللہ فاروقی کی بہت سی یادیں جڑی ہوئی تھیں، کلکتہ پر انھوں نے ایک طویل مثنوی بھی رقم کی ہے، جو ان کی کتاب 'اوراق مصور' میں شامل کی گئی ہے۔

رضوان اللہ فاروقی سیدھے سادے الفاظ میں بہت کچھ کہہ دینے کا ہنر رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں معانی کی پرتیں دکھائی دیتی ہیں، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

کہو کہو کہ ہے مرگ خوشی کا اندیشہ　چلو یہ بات بھی مانی رہے رہے نہ رہے
رکو رکو ہے ابھی اور تلخیوں کی ہوس　یہ کیف شب یہ گرانی رہے رہے نہ رہے
ابھی ابھی کوئی پیمان زندگی کرلیں　کہ چشم تر میں روانی رہے رہے نہ رہے

(متاع سحر، ص-۱۲۴)

رضوان اللہ فاروقی اپنے علم و ادب اور تجربات سے بہت کچھ کشید کرکے قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں، وہ سادے سے الفاظ میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔

کہنے کو ٹوٹا ہے دل، درد کی انتہا نہ پوچھ
کیسی شکست و ریخت ہے، گرم ہے کیا ہوا نہ پوچھ

(متاع سحر، ص-۱۱۷)

رضوان اللہ فاروقی ہمالیائی ہمت و حوصلے والے انسان ہیں، وہ اپنی شاعری کے ذریعہ اشاروں اشاروں میں قارئین کو مسائل و مشکلات سے لوہا لینے اور مسکرانے کے آداب سکھاتے ہیں:

جاگتے پہروں سوئے رہنا، اپنے غموں میں کھوئے رہنا
خون جگر سے لمحہ لمحہ، دیدۂ تر کو دھوئے رہنا

(متاعِ سحر، ص-۱۱۹)

رضوان اللہ فاروقی کے امتیازات میں سے ایک ان کی ترجمہ نگاری ہے۔ یوں تو ترجمہ نگاری ایک مستقل فن ہے اور اس فن میں بہت سے لوگوں نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں، مگر رضوان اللہ فاروقی کی شخصیت اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ انھوں نے خود اپنے ہی کلام کا دوسری زبان میں ترجمہ کر کے مترجمین کو ایک نئی فکر اور جہت کی راہ دکھائی ہے۔ ان کی اپنی خود کی شاعری کے ترجمہ کے حوالے سے ظہیر انور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "The creative energy in the original Urdu verses and the genuine effort of the poet himself to convey the meaning and essence of the original in English language are commendable and louched me."

رضوان اللہ فاروقی کی شاعری حکایت دلبراں سے زیادہ حکایت خونچکاں کی داستان ہے:

گزر رہی ہے جو دل پر ذرا کسی سے کہو
کسے ہے تاب سنے، تم بھلا کسی سے کہو
غم جہاں ہو تو کہہ کر کسی سے ہلکا ہو
نہ ہو جہان کا غم ہی تو کیا کسی سے کہو
کبھی بھر آئے یونہی دل تو کیا کرے کوئی
چلو درست، برائے خدا کسی سے کہو
شکست خواب کا صدمہ کسی نے سمجھا ہے؟
رہا نہ خواب، رہا بھی تو کیا کسی سے کہو

نفس نفس سے لہو چوستی ہے تنہائی یہ کرب، درد و الم، ابتلا کسی سے کہو
(عکس خیال،ص-۷۳)

What is happening to your heart tell a little to someone; Who has the heart to listen, but still speak to someone; Worldly grief would lighten by telling it to someone; When the grief is not worldly what could be told to someone; Whenever the heart wells-up for no reason what one can do; Come on! True! for God's sake speak to someone; Loneliness is sucking blood from every breath; Tell this anguish, pain and pang and misery, to someone.

رضوان اللہ فاروقی ایام ماضی کے بیتے لمحات کو یاد کرکے کہتے ہیں:

تیری انا پئے خروش، میری انا گلیم پوش فکر تری گریز پا سرتاقدم ہوں گوش و ہوش
کیسا زمانہ آ گیا، برف رگوں میں ہے رواں ایک زمانہ وہ بھی تھا، بے غم و محو ناو نوش
وقت ہے کیا کرشمہ گر تیر کو بھی کماں کرے غم سے یہ سرگراں نہ تھا، اب وہی سر ہے بار دوش
آرزو اب کرے بھی کیا، کب سے بجھا ہوا ہے دل لحن صدائے درد ہے، اس کو تو نغمۂ سروش
شعر و سخن کی بات بھی اب تو محال ہوگئی عہد شباب کرگیا، فکر سخن کفن بدوش
(عکس خیال،ص-۷۷)

ماضی میں بیتے مصائب و مشکلات کے سخت ترین اوقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دنیا نے ہماری کیا آشفتہ سری دیکھی؟ ہر سنگ سے ٹکراتے کیا دربدری دیکھی؟
کچھ جوش جنوں کم ہو، کچھ درد کا درماں ہو اس نخل تمنا کی کب شاخ ہری دیکھی؟
(عکس خیال،ص-۷۹)

زمانے کے بدلتے تیور اور حالات کے بدلتے رخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

غنچۂ خام سے ڈر لگتا ہے گل کے انجام سے ڈر لگتا ہے

سنگ ملتے ہیں گلوں کے بدلے پھول کے نام سے ڈر لگتا ہے
(عکس خیال،ص-۸۷)

ہمت وحوصلہ، خوشی وغم اور آس و یاس کے دھند لکے میں اپنی لاچارگی وخستہ حالی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بجھتی آنکھوں میں نور باقی ہے جلوۂ بے حجاب دیکھتے ہیں
اپنی ہستی میں جھانک لیتے ہیں اور ذرے میں تاب دیکھتے ہیں
ہم تموج میں بحر ہیں پھر بھی زندگی کو حباب دیکھتے ہیں
اس نے جنت بنالی دنیا میں ایک ہم ہیں عذاب دیکھتے ہیں
(عکس خیال،ص-۸۹)

رضوان اللہ فاروقی کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ اپنی حالت غیر کی طرف توجہ نہ کرکے دوسروں کے معمولی مسائل میں الجھ کر خوامخواہ ہلکان ہوتے رہتے ہیں، ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ اپنے مسائل کو حل کرنے کی طرف زیادہ توجہ دیں:

اپنے دکھ کی لپٹیں کم ہیں؟ غیر کے دکھ میں کیوں بلتے ہو؟
بجھنا ٹھہرا بجھ بھی جاؤ ٹم ٹم ٹم ٹم کیوں جلتے ہو؟

اپنی حالت زار پر راتوں کو اٹھ کر کروٹیں بدلنا، بے چینی کے عالم میں کبھی اٹھنا، کبھی بیٹھنا اور کبھی گھر سے باہر نکل کر آسمان میں تارے گننا، انسان کو سوچوں کی نئی دنیا کا سیر کراتا ہے، ایسے ہی عالم میں کچھ اس طرح کے اشعار نکلتے ہیں:

میرے دکھ پر چار پہر تک، کل تو بہت ہی روئی رات
جاگ پڑے اور اٹھ اٹھ بیٹھے کتنے پڑوسی، سوئی رات
صبح کا آنچل مشرق میں بے وجہ نہیں گلنار صفت
خون جگر جو میں نے نچوڑا اس میں ساری ڈبوئی رات

میری شریک حال جو شب تھی، اس کا تن تھا داغ ہی داغ
صبح کا دامن اجلا کیوں ہے، اشک سے میں نے دھوئی رات
اپنا اپنا سب کا مقدر سب ہی ستم آگاہ نہیں
بار الم سے بھاری تھی اٹھ بیٹھ کے میں نے ڈھوئی رات
آنکھ ذرا بھی لگ جاتی تو ممکن تھا اس غفلت سے
کچھ تو ہوتا غم کا مداوا ایسی آتی کوئی رات

(متاع سحر،ص-۱۱۶)

رضوان اللہ فاروقی کہتے ہیں کہ خاموشی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اب دل سکون سے ہے، بلکہ افشائے راز کے خوف سے اپنی حالت زار کو کسی سے بیان کرنے سے گریز کررہا ہوں:

نہ دکھا سکا تجھے داغ دل، نہ سمجھ کہ بجھ گئے سب دیے
یہ لحاظ مجھ کو ضرور ہے، نہ ہو داستاں یہ زباں زباں

(متاع سحر،ص-۱۲۲)

حالات کی تپش میں تیزی سے گزرتے لمحات اور یادوں کے جھرونکوں سے ابھرتے عکس پر حیرت واستعجاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بدل رہے ہیں دما دم نقوش شام وسحر — نہ رہنما کا پتہ ہے نہ کوئی راہ گزر
جنوں نے درس دیے سعی رائیگاں کے مگر — خرد کہاں ہے بتائے تو راستہ ہے کدھر
لہو لہو ہے کف پا عرق عرق ہے جبیں — عجیب حال میں جاری ہے، کیا کہیں، یہ سفر
کہاں چلے تھے ہمیں وقت بھی کہاں لایا — کڑی ہے دھوپ، نہ سایہ ہے دور تک نہ شجر

(عکس خیال،ص-۹۷)

رضوان اللہ فاروقی پورے نو دہائیوں کے شاہد ہیں، وہ ایک کہنہ مشق صحافی بھی

رہے ہیں، ہر چیز کو باریک بینی سے دیکھنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ان کے احساسات میں شدت اور جذبات میں نزاکت ہے،عفت و پاکیزگی، دین داری اور خوش مزاجی ان کا خاصہ رہا ہے اور یہی سب باتیں ان کی شاعری میں جابجا دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسانی قدروں کے خلاف کچھ بھی ہوتا ہے تو ان کا قلم بے اختیار متحرک ہوجاتا ہے۔سیاست پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سیاست کیا ہے مشق ترک تازی　　سیاست کیا ہے شغل گرگ بازی
ستم کاری برائے سربراہی　　سیاست اک طریق کم نگاہی
سیاست نے سکون قلب چھینا　　پریشاں حال ہیں مشکل ہے جینا
سیاست نے لہو پہلے تو چاٹے　　ہمارے نیم مردہ جسم بانٹے
ہماری فکر کی بنیاد ڈھادی　　ہماری علم کی دنیا لٹادی

رضوان اللہ فاروقی ابن الوقتوں،خودغرضی پر مصلحت کا ماسک لگانے والوں اور حقیقت پر حرص و ہوس کی دبیز چادریں ڈالنے والوں کے خلاف بہت ہی تیکھا طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

رسم اب یہ ہے قاتل کو نہ قاتل لکھنا　　ظلم جتنا بھی ہو باطل کو نہ باطل لکھنا
کشتی گرداب میں طوفاں کے مقابل رکھنا　　یہ بھی لازم ہے کہ ساحل کو نہ ساحل لکھنا

(متاع سحر،ص-۱۲۷)

دکھاوے کی جمہوریت اور جمہوریت پرستی پر کاری ضرب لگاتے ہوئے کہتے ہیں:

مساوات جمہوریت میں کہاں ہے　　کہیں ہے عنایت زیادہ، کہیں کم
لب ورخ کی باتیں تفنن ہیں رضواں　　کیا ہے زمانے کی گردش نے بے دم

(متاع سحر،ص-۱۲۱)

تقسیم وطن کے بعد ملک میں جو خونیں کھیل شروع ہوا، اس کی ایک جھلک

رضوان اللہ فاروقی کی طویل نظم سے نقل کردہ ان چند ابیات سے بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

تقسیم کیا ہوئی کہ ہوئے تن سے سر جدا　　بھائی بہن جدا ہوئے، مادر و پدر جدا
اک اک شجر سے ٹوٹ کے شاخ شجر جدا　　شاخوں سے برگ برگ جدا، ہر ثمر جدا
صحن و ثقف جدا ہوئے، دیوار و در جدا　　رستے جدا جدا ہوئے، ہر گھر سے گھر جدا
آب و ہوا جدا ہوئے، شمس و قمر جدا　　گویا کہ یک بیک ہوئے شام و سحر جدا
جو سرزمین بنگلہ تھی، دولخت ہوگئی　　بے رحم آسماں تو زمیں سخت ہوگئی
اہل خرد تو سارے خرد باختہ ہوئے　　چہروں کے رنگ ایسے اڑے فاختہ ہوئے
میراث چھوڑ چھوڑ کے وارث چلے گئے　　سب کور چشم سوئے حوادث چلے گئے
ہرہ گزر پہ لوٹے گئے کارواں کے لوگ　　دولت لٹی، سہاگ لٹے، بے نشاں تھے لوگ
آتے تھے لوگ، جا بھی رہے تھے بچارے لوگ　　کیا اجنبی ہوئے تھے جو کل تھے ہمارے لوگ
پایا کسی نے کچھ نہ عجب ماجرا ہوا　　کھویا سبھی نے جو بھی ہوا بس برا ہوا
ملت کو کاٹ چھانٹ کے بے کار کردیا　　اعضاء کو پھر بھی برسر پیکار کردیا
کوفہ تھا کلکتہ یہی ہوگلی فرات تھی　　بے سر ہمیں تھے اور ہماری ہی مات تھی
ہندو نہ خوش ہوا نہ مسلماں خوش ہوا　　فتح عظیم اس کی تھی، شیطان خوش ہوا
لیگی تو اپنی ساری سیاست سمیٹ کے　　ڈھاکہ چلے گئے تھے چٹائی لپیٹ کے
جب سارے باب بند سیاست کے ہوگئے　　قسمت کو روتے روتے مسلمان سوگئے

(عکس خیال،ص-۳۹-۱۳۱)

عالمی منظرنامے پر نظر ڈالتے ہوئے عالمی سربراہان کی خسیس سیاست پر اپنے کرب و کسک کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ابتر بہت دنوں سے ہے دنیائے رنگ و بو　　پھرتے ہیں سربراہ و سلاطین کو بکو

لیکن سوال یہ ہے کہ آئے گا دن وہ کب　　جب آدمی کے ہاتھ سے انساں ہو سرخرو
(عکس خیال، ص-۹۹)

افغانستان میں پیدا ہوئے عالمی بحران پر اپنی ذہنی کوفت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کیا لہو ارزاں ہوا ہے! آبشاروں میں لہو　　کوہساروں پر لہو ہے، سبزہ زاروں میں لہو
جو صبا لاتی تھی بوئے گل وہ راکٹ بار ہے　　عشق پیچاں اب نہیں ہے، گولیوں کا ہار ہے
اوٹ میں بادل کے کوہ سیم و زر پنہاں نہیں　　اب قیامت خیز بم ہیں، ترکش و پیکاں نہیں
یا خدا کس کی نظر ہے اس فراز کوہ پر!　　کس کی حرفت کار فرما کاشمر تا کاشغر!

رضوان اللہ فاروقی کا قیام دہلی میں تقریباً نصف صدی کے عرصہ تک رہا، ان کی قیامگاہ ابوالفضل انکلیو میں تھی اور اب ان کی آخری آرامگاہ بھی یہیں، شاہین باغ کے قبرستان میں واقع ہے۔ اتنے طویل عرصہ تک قیام کے دوران دہلی کے موسم، یہاں کی آلودہ فضا، یہاں کی خوبیاں اور خامیاں سب کچھ ان کے ذہن و دماغ میں نقش کر چکی تھیں، 'دہلی نامہ' کے عنوان سے ان کی نظم ان ہی سب باتوں کی عکاسی کرتی ہے:

ابھی تو جم کے پڑ رہی ہیں اوس کی پھوار ہا　　چھٹے تو کچھ نظر پڑے کہ کیا ہے جمنا پار ہا
جگہ جگہ قلعے کھنڈر، کھنڈر میں مسجدوں کے در　　دروں سے متصل ہیں گھر، گھروں میں ہیں مزار ہا
پرانی دلی جایئے، کباب سیخ کھایئے　　وہیں پہ دیکھ آیئے، غرار ہا شرار ہا
سیاستوں کے پہلوں، وزارتوں کے درمیاں　　ضمیر بیچ نغز خواں، نہ دہ، نہ صد، ہزار ہا
جو گرمی آئے لو لیے، غلاظتوں کی بو لیے　　پھرے وہ چار سو لیے، غبار ہا، بخار ہا
جناب رضواں آیئے، کہیں نہ اور جایئے　　یہیں پہ کچھ سنایئے، ہمیں بھی نظم پار ہا
(اوراق مصور، ص-۹۰)

رضوان اللہ فاروقی نے آزاد نظموں میں بھی طبع آزمائی کی ہے، بطور نمونہ یہاں

ان کی چند نظمیں پیش کی جارہی ہیں:

آتش خفتہ

خزاں رسیدہ ہیں گر بہاریں
انہی خزاؤں کا جشن ہوگا
زمانے وہ بھی تو یاد ہوں گے
جو روز جشنِ بہار ہوتا
نہ جاؤ پتوں پہ ٹہنیوں پر
جو سوکھ کر چرمرا گئی ہیں
ابھی بھی ان میں ہے آگ پنہاں
ابھی ہیں شعلے بھی خواب آگیں
خروش چنگاریوں کا خفتہ
نہ چھیڑو ان کو
ابھی نہ چھیڑو

خلش

اے قلم! آ تجھے بوسہ دے دوں
درد شاید کوئی بیدار ہوا
کہ خلش آج مرے دل میں سوا ہوتی ہے
دستکیں درد کی پہلے بھی تو ہوتی تھیں، مگر
چھپ کے پہلے بھی تو روئے درودیوار کے ساتھ
کیا گنہگار نہ تھے لوگ پرانے بھی، مگر
غم کی دنیا بھی بہرطور تھی آباد، مگر

غمزدہ کوئی ہوتو غمخوار ہوا کرتے تھے
کتنے پردے میں گنہگار ہوا کرتے تھے
ہر جراحت کے لیے نسخۂ مرہم ہوتا
درد ہوتا تھا مگر تم کے بھی کم کم ہوتا

فارسی کلام

رضوان اللہ فاروقی نے اپنے اردو اور فارسی اشعار کا بذات خود انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور لاجوب کیا ہے، جس کے بارے میں کئی نقادوں نے اظہار تحسین کیا ہے۔ اس تعلق سے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

"I like the idea of Urdu poems appearing with their English translation which have been made by the author himself. The Urdu poems are quite good, if somewhat simple but the English translations are generally excellent, certainly better than anything I have seen recently.

رضوان اللہ فاروقی کی فارسی رباعیاں اگرچہ تعداد میں بہت کم ہیں، لیکن جو بھی ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں، اشعار کے انگریزی ترجمے خود انھوں نے ہی کیے ہیں، بطور نمونہ ان کی چند رباعیاں یہاں رقم کی جارہی ہیں۔

رضوان اللہ فاروقی کو اپنے آبائی وطن سے بے حد لگاؤ تھا، وہ وہاں کے قصبوں اور قریوں کو روم و شیراز اور اصفہان سے تعبیر کرتے ہیں، وہ گیہوں کے خوش رنگ پودوں کو زعفران کے ہم پلہ گردانتے ہیں، ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دیہہ و دہقان پاستان مرا روم و شیراز و اصفہان مرا
کشت گندم و انبہ بر اشجار زعفراں زار و بوستان مرا

(عکس خیال، ص-۱۸۴)

Village and the rustic are my past; They are my Rome, Shiraz

and Asfahan, The wheat field and mango on trees; Are my saffron fielded and garden.

جیسا کہ ماقبل میں ذکر ہوا کہ رضوان اللہ فاروقی کو اپنے آبائی وطن، وہاں کے لوگ، وہاں گلیاں اور کھیت کھلیان سب انھیں محبوب ہیں اور وہاں کی سبھی چیزوں سے وہ ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وطن سے سیکڑوں میل دور بیٹھ کر بھی اپنی مٹی کی سوندھی خوشبو کو اپنی ہر سانس میں محسوس کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انہی سب باتوں کی عکاسی ہے، وہ لکھتے ہیں:

بسرم گذشت بگوئمت، چہ خجستہ بود دیار ما
ہمہ کشت زر ہمہ باثمر کہ خزاں ندیدہ بہار ما
نہ بہشت بود بریں زمیں ولے ما فدا و فریفتہ
ہمہ تلخ و ترش زمانہ ہم نتواں شکست خمار ما

It occurred to my mind to tell you how blessed was our nativity; All fields of gold, all full of fruits for, our spring had never seen the autumn.

It was not the paradise on earth, but we were dying for and loved it; All the bitter and sour of times could not break our intoxication.

رضوان اللہ فاروقی اپنی کتاب ''اوراق مصور'' کے لیے ذیل کے چند اشعار لکھتے وقت اپنی کم مائیگی کا اظہار اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ جو کچھ بھی ہوسکا ہے وہ محض توفیق الٰہی ہے:

حقا کہ این ضعیف نہ تاب کلام داشت　　این ہم عطائے اوست نوائم دوام یافت
از بہر ہمنوائی بسوئے قلم شتافت　　قرطاس را برائے قلمرو نگاہ داشت
دربائے شاہوار دراں مرغزار کاشت　　نوطرز بوستانے کہ رضواں میاں گذاشت

(عکس خیال،ص-۱۰۰)

By God, I was too weak to speak; It is His blessing that perpetuated my wail; Ran towards the pen for a company; Looked at the paper for an empire; Sowed precious pearls in that soil; Rizwan Mian left a new form of garden.

کلکتہ کی اردو صحافت پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قلم چوں بہ قرطاس تیشہ زند　　جہان نہفتہ درو برکند
ز ترسیل اخبار عالم تمام　　چو مہر درخشاں مجلّا کند

(عکس خیال،ص-۵۸)

The pen when hammers the paper; Brings out the world underneath; By communicating the news illumines; The whole world like the bright sun.

ذیل کے سطور میں رضوان اللہ فاروقی کی چند دیگر فارسی رباعیاں شامل کی جارہی ہیں:

چو سیر گلستاں بہ پایاں رسید　　ثمرہائے کشتم بہ داماں رسید
بہ توفیق و تائید پروردگار　　بہ اوراق احوال رضواں رسید

(اوراق ہستی،ص-۳)

باد بہار از بہشت، آب وگل چمن بیار　　بو بگلاب می خزد، گو کہ 'بیا بیا بکار'
نغمۂ نے ز نیستاں، سوز درون دلگداز　　شور و فشار رودبار، زعم وسکوت کوہسار

(متاع سحر،ص-۱۳۱)

ما چراغ ہستیم و پروانہ خودیم　　طرفہ خود آگاہ و دیوانہ خودیم
پاسدار آبروئے درد خویش　　ما صدف ہستیم و دردانہ خودیم

(عکس خیال،ص-۳)

I am the lamp, and the moth myself; A peculiar self-conscious and crazy myself; A defender of the honour of my own pain; I am the shell and the pearl myself.

تمام عمر نشستیم و شب سحر کردیم ۔ دراز بود ہماں قصہ، مختصر کردیم
درون سینہ نگہ داشتیم لعل و گہر ۔ ہمان بود کہ، رضواں میاں، ہنر کردیم
(اوراق ہستی، ص-۳)

سحر دمید بیا بام و در کشادہ کنیم ۔ بیا کہ قصۂ فصل بہار تازہ کنیم
بیا کہ خوشۂ دل جام ارغواں پر کرد ۔ بیا بیا کہ بہم باز شغل بادہ کنیم
(عکس خیال، ص-۱۸۴)

Morning has dawned, come, let's open the terrace and doors; Come let's repeat the story of spring season; Come, the bunch of the heart has filled the red goblet; Come come, let's again indulge in drinking together.

علم انسان کو حلم و بردباری سکھاتا ہے، علم کے ذریعہ معرفت ملتی ہے، علم ہی انسان کو رہبری عطا کرتا ہے، اگر عالم اپنے علم پر عمل کرنے لگے تو دنیا و آخرت میں سرخرو ہو جاتا ہے ورنہ زندگی بھر بارِ کتب سے گرانی محسوس کرتا رہتا ہے۔ رضوان اللہ فاروقی علم کی اہمیت، اس کی خصوصیت اور اس کی فضیلت کو بیان کرتے کہتے ہیں:

رفت افتاں تا رسد با مرشدش ۔ لب کشاید در بیان کشمکش
کشمکش بودے 'کرا گویند علم؟' ۔ 'از کجا و تا کجا جویند علم؟'
علم در بند قبا مستور نیست ۔ پیچ و طرہ علم را منظور نیست
علم در مرد خدا یابی اگر ۔ از ہمہ عالم جدا او ہم نگر
علم او را در جہاں مشغول داشت ۔ درمیان بندگان مقبول داشت
کاش بر عالم در علمش کشاد ۔ علم را در کارہا رہبر کناد

علم بے دانش بود دانائے کور   پیل تن بے زور باشد مثل مور
او کجا داند مقام عالماں   آنکہ بر تر از صف کروبیاں
حیف آں پشتارہ بردار کتب   نے خرد افزودہ از بار کتب
حیف آں عالم کہ مردم می گزد   یعنی علمش را مزارے خود کند
انکسار از علم می یابد فراغ   نے فزود از انتشار البلاغ
علم یک شعلہ کہ آہن را گداخت   شعلۂ ہر سنگ دل را موم ساخت
علم از طور جنوں بیگانہ است   از جنوں بیگانہ و فرزانہ است
علم خود بالذات پردہ می شود   چوں کسے نا اہل بر دوشش برد
اے پسر گر علم داری ہوش دار   تانہ سوزی دامن خود ہوش دار
نور را در شیشۂ محصور کن   شیشۂ دل را ازو معمور کن

(عکس خیال، ص-۶۳-۱۵۵)

Hurridly rushed to reach his mentor; To speak out his dilemma; The dilemma was, "What is called knowledge?" "From where to where the knowledge is being sought"; "Knowledge is not hidden under the tied gown"; "Knowledge does not approve of folds and crest of a turban"; "If you find knowledge in a man of God"; "See him different from the whole wold"; "Knowldge kept him busy in the world"; "Made him popular among the people"; "Had the door of his knowledge been open on the world!"; "Had the knowlege been made a path leader in all affairs!"; "Knowledge without wisdom is a blind wise man; "A wrestler weak like an ant; "Where does he know the stature of the learned; "Who are better than the angelkind?"; Pity on the bearer of book loads; Wisdom does not grow with the book load; Pity on the scholar who bites man; Or he himself digs the grave of his knowledge; Humility increases with knowledge; Doesn't increase by

circulating Al-Blagh; Knowledge, a flame that melts iron; A flame that makes wax of every stone hearted; Knowledge is ignorant of crazy manners; Ignorant of fury, and it is wise; Knowledge itself is a curtain; When a naive carries it on his shoulder; O boy! If you have knowledge beware!; So that you may not burn you self, beware!; Secure the light inside a glass; Brighten your heart's mirror with that.

خسرو کی معروف زمانہ غزل ''نمی دانم چہ منزل بود، شب جایی کہ من بودؔ' کی منظوم ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وہ جہاں بھی کیسا جہان تھا، جہاں رات میری گزر گئی
وہ ہوائے شوق تھی مشک بو، رگ جاں کو جیسے کتر گئی
شب تار جو کہ تھی ہمسفر، کسی راستے میں بسر ہوئی
ہو بیان وحشت دل بھی کیا، جو گزرگئی سو گزرگئی
جہاں دھڑکنوں کا حساب تھا، وہیں کان اس پہ لگے ہوئے
نہ کسی کو پھر بھی خبر ہوئی، نہ کسی کی اس پہ نظر گئی
یہ جو لامکاں ہے مکاں تو ہے، تو کہیں بھی ہونا ضرور ہے
وہ اسی کا حکم تھا بالیقیں جو زمیں پہ نوع بشر گئی
کوئی رشک حسن تمام تھا، وہی قدوقامت سروسا
وہی برق جس کا بیاں ہو کیا، جو گری تو دل میں اتر گئی
وہ دعا تھی میرے شکستہ دل کی جو سد رہ پر بھی نہ رک سکی
رہ عرش اس کی نظر میں تھی، نہ ادھر گئی نہ ادھر گئی

(عکس خیال،ص-٦١)

رضوان اللہ فاروقی نے اپنی ہی شاعری کا ترجمہ کیا ہے اور واقعی لاجواب کیا ہے،

اس تعلق سے ف۔س۔اعجاز رقمطراز ہیں:''رضوان اللہ صاحب کا شعور انھیں شاعری میں کسی قسم کے تخلیقی جتن سے کبھی فارغ نہیں ہونے دیتا۔ ان کی ایک سے زائدفنی جہات میں اب ایک اور جہت کا اضافہ ہوا ہے اور وہ ہے اپنی ہی اردو شاعری کے انگریزی مترجم کی حیثیت کا۔گویا اپنے ہی اندر دریائے فن پر ایک پل تعمیر کر کے دو کناروں کو ملانے کی سعی۔''

رضوان اللہ فاروقی کے قلم کی جولانی اس وقت مزید دوبالا ہوجاتی ہے جب وہ ثنائے الٰہی یا نعت مصطفیٰ میں محو ہوتے ہیں۔اس وقت ایسا لگتا ہے جیسے وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوکر رب کے حضور میں یا بارگاہ رسالت میں جا پہنچے ہیں۔حمد باری تعالیٰ پر لکھے گئے ان کے کلام کا مشاہدہ فرمائیں:

خدا تو ہی خدا تو بڑا تو ہی بڑا تو
جہاں تیرا ہے تو ہے خدائے دوسرا تو
کوئی میرا نہیں ہے کوئی ہے تو، مرا تو
شکستہ دل تھا میرا ہوالشافی، دوا تو
بھٹکتا پھر رہا ہوں دکھادے راستہ تو
نہیں کچھ، قصہ کوتہ کہ سارا ماجرا تو
تجھے مانگوں تجھی سے دعا کا مدعا تو
گدائے بےنوا ہوں تو ہی ہے آسرا تو

رضوان اللہ فاروقی کے نعتیہ کلام میں حب رسول کی گہرائی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ان کے نعتیہ کلام سے آپ بھی حظ حاصل کریں:

دل و جاں بہ تو دادہ ام یا محمد نگاہے بہ چشم کرم یا محمد
بہ یادت دلم خوں گرفتہ ولیکن بہ چشمم بود اشک نم یا محمد

چوں آید بروں از لبم اسم احمد　　فرو می رود سیل غم یا محمد
مقام تو باشد کجا در دوعالم!　　بہشت است زیر قدم یا محمد
چوں بے آب ماہی ہمہ پیچ وتابم　　ز دوری بہ آتش تنم یا محمد
اگر گرد کوئے مزار تو یابم　　ہماں کحل چشمم کنم یا محمد
پناہم تویی شافع روز محشر　　چوں نفسم شدہ دشمنم یا محمد
چناں کن کہ رضوان بگردد مشرف　　بہ دیدار و طوف حرم یا محمد

رضوان اللہ فاروقی کے دعائیہ کلام بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے دعائیہ اشعار میں عجیب طرح کی جذب ومستی اور آبشاروں سے گرتے پانی کی روانی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے دعائیہ کلام کو آپ بھی ملحوظ کریں:

ترحم کن کہ بسم اللہ گویم　　ترحم کن کہ الا اللہ گویم
ترحم کن کہ رحمٰن و رحیمی　　ترحم کن کہ غفار و کریمی
ترحم کن کہ تو اول و آخر　　ترحم کن کہ تو حافظ و ناصر
ترحم کن کہ خیرالوارثینی　　ترحم، تو الہ العالمینی
کرم یا رب برائے مصطفیٰ کن　　برائے فاطمہ و مرتضیٰ کن
منم فاروق زادہ کن ترحم　　گرفتارم بہ گرداب و تلاطم
ثنا خوان عمر، صدیق و عثمان　　نگاہے کن بلند از حد امکان
ترحم کن بہ پیشم کربلا است　　زمہ شمر خنجر آزما است

رضوان اللہ فاروقی شاعر کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں اور یہ 'بہت کچھ' ہی دراصل ان کی شاعری کو دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے کلام میں کرب وکسک کا جتنی کثرت سے بیان ہے وہ بہت کم ہی شعرا کے حصہ میں آتا ہے۔ رضوان اللہ فاروقی کے کلام کے ساز سیدھے دل کے تاروں کو جھنجھوڑتے ہیں۔ حزنیہ شاعری تو بہتوں نے کی ہے،

مگر ذاتی درد کو درد دوراں بنانے کا ہنر رضوان اللہ فاروقی کے کلام میں درجۂ کمال کو پہنچا ہوا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کو پڑھ کر قاری بے اختیار آہ آہ اور واہ واہ کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ رضوان اللہ فاروقی کے علمی سمندر سے یہاں محض چند قطرے ہی قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا سکے ہیں، ان کے پورے کلام کا احاطہ کرنا ' کارے دراز دارد'۔

■❖■

رضوان اللہ فاروقی کی تبصرہ نگاری

ڈاکٹر شاداب تبسم
شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

بزرگ صحافی رضوان اللہ فاروقی 8/اکتوبر2022 کو 92 سال کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت کر گئے۔ان کے انتقال کی اطلاع 8/اکتوبر2022 کو جناب سہیل انجم صاحب نے غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں منعقد ہونے والے سمینار بعنوان'' جی.ڈی. چندن کے سو سال اور اردو صحافت کے دو سو سال'' میں دی۔ اگلے دن یعنی 9/اکتوبر کو ان کی وفات کی خبر مختلف اخبارات میں چھپی۔مرحوم کی دختر نیک اختر ڈاکٹر زہرہ خاتون (معلّمہ، شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ) سے میرے دوستانہ مراسم ہیں۔ان سے شعبۂ فارسی میں میں نے بغرض تقریب ملاقات کی۔ڈاکٹر زہرہ خاتون نے مجھے اپنے والد مرحوم کی کتاب ''تبصراتِ کتب'' عنایت فرمائی۔

رضوان اللہ فاروقی ایک اچھے اور بے باک صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ پُر گو شاعر اور اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کے مضامین مختلف اخبارات میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ان کی متعدد کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں ''اوراق ہستی''، ''شگوفے''، ''عکس خیال''، ''ہمارے گاؤں ہمارے لوگ''، ''متاعِ سحر''، ''کلکتہ کی اردو

صحافت اور میں'' ، '' اوراقِ مصور'' ، '' بے ادبیات'' اور '' تبصرات کتب'' کے علاوہ تقریباً چھ(6) کتابیں اردو سے انگریزی میں ترجمہ کی ہیں۔

رضوان اللہ فاروقی کی تبصرہ نگاری پر گفتگو سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فن تبصرہ نگاری کی روایت پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

'' تبصرہ'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنیٰ 'بصارت دینا' یا 'بینا کرنا' ہیں۔ مگر اصطلاح میں تبصرہ کے معنی کسی بات کے متعلق روشنی ڈالنا، اس کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنا اور اس کی توضیح و تفصیل بیان کرنا ہیں۔ تبصرہ کو انگریزی میں Review کہتے ہیں ۔ اردو میں تبصرہ نگاری کے حوالے سے مختلف مباحث کا آغاز بھی اس کی روایت کے ساتھ ملتا ہے۔ 'الہلال' اخبار میں محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

'' ریویونویس پبلک کی طرف سے بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر رکھتا ہے وہ لوگوں کو مشورہ دیتا ہے کہ فلاں فلاں کتاب کا مطالعہ کریں اور فلاں فلاں کتاب خریدیں پس یہی ضروری ہے کہ مشورہ پوری امانت داری اور دیانت داری کے ساتھ ہو۔''

(محمد حسین آزاد، الہلال، ۱۹ مارچ ۱۹۱۳ء)

بقول ظ. انصاری:

'' سکڑے تو تبصرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کھلے تو تنقیدی مطالعہ۔''

(ظ. انصاری، کتاب شناسی، ممبئی، ۱۹۸۱، ص:۴۶)

گیان چند کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیں:

'' تبصرہ تنقید کی وہ شاخ ہے جو کسی کتاب یا مختصر تخلیق کے بارے میں کی جاتی ہے۔'' (گیان چند جین، مقدمے اور تبصرے، ثمت آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی، ۱۹۹۰، ص:۱۱)

تارا چند رستوگی تبصری نگاری کے تعلق سے لکھتے ہیں:

'' تبصرہ کو تعارف کا مترادف سمجھنا چاہیے۔''

(تارا چند رستوگی، تنقید و تبصرہ، شان ہند پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۳، ص:۵۷)

بقول حالی:

''ہمیں دیکھنا چاہیے کی کتاب کا عنوان کیسا ہے، ترتیب کیسی ہے، طریقۂ استدلال مذاق وقت کے مطابق ہے کہ نہیں۔ اور کتاب لکھنے میں جو غایت مصنف نے اپنے ذہن میں محفوظ رکھی ہے وہ اس سے حاصل ہوسکتی ہے یا نہیں۔''

(بحوالہ: آل احمد سرور کے تبصرے، مرتب ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۳، ص:۳)

فن تبصرہ نگاری کے مناسب خد و خال وضع کرنے کے لیے شمس الرحمٰن فاروقی کا نام بھی بہت اہم ہے۔ ان کے علاوہ کلیم الدین احمد، رئیس انور، اسلوب احمد انصاری اور غلام جیلانی اصغر کے علاوہ متعدد نام ایسے ہیں جنھوں نے فن تبصرہ نگاری کے تعلق سے اظہار خیال کیا ہے۔ ان خیالات کی روشنی میں مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کی تبصرے میں کسی کتاب کے اہم یا غیر اہم ہونے سے متعلق مبصر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ عموماً ان خیالات کی شائع شدہ شکل کو ہی تبصرہ تصور کیا جاتا ہے۔ تبصرہ باقاعدہ تنقیدی مضمون نہیں ہوتا مگر تنقیدی آرا کے بغیر اس کو مکمل بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تبصرے کا مقصد شائع ہونے والی کتاب اور مصنف کا مختصر تعارف بھی ہوتا ہے تا کہ قارئین کو کتاب پڑھنے کی ترغیب ملے اور ان کے اندر تجسس بھی پیدا ہو۔ کتاب کی قیمت، مقام اشاعت، ضخامت وغیرہ بھی تبصرہ نگاری کے لوازمات میں سے ہیں۔ مبصر کے لیے ضروری ہے کہ وہ وسیع العلم، غیر جانب دار اور فن تبصرہ نگاری کے بنیادی لوازم سے بخوبی واقفیت رکھتا ہو۔

اردو ادب میں تبصرہ نگاری کی روایت بہت قدیم نہیں ہے۔ اردو ادب میں تبصرہ نگاری کا دور انگلستان سے سر سید احمد خاں کے توسل سے ہوا۔ سر سید احمد خاں کے رفقا نے تبصرہ نگاری کو حیات نو بخشی۔ ان حضرات کے بیشتر تبصروں میں طوالت پائی جاتی ہے جس کا اصل سبب یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک تبصرہ نگاری کا کام کتاب کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنا اور مصنف کے زاویۂ نظر کی وضاحت کرنا بھی ضروری تھا۔ ''اودھ پنچ'' میں

تبصرہ نگاری تنقیدی مباحث کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق نے اردو تبصرہ نگاری کو نئی رفعتوں اور وسعتوں سے آشنا کیا۔

ابوالکلام آزاد، پریم چند، حافظ محمود شیرانی، نیاز فتح پوری، عبد الماجد دریا آبادی، مہدی افادی، مسعود حسین رضوی ادیب، سید احتشام حسین، آل احمد سرور، ظ۔ انصاری، رشید حسن خاں، کلام حیدری، گیان چند جین، خلیق انجم، شمیم حنفی، شمس الرحمٰن فاروقی، انور سدید، رئیس انور وغیرہ کے علاوہ بھی متعدد مبصرین نے فن تبصرہ نگاری کے اصولوں کی روشنی میں تبصرے لکھے، اور یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ اعجاز علی ارشد، علی احمد فاطمی، خالد محمود، حقانی القاسمی، کوثر مظہری، ہمایوں اشرف، ابوظہیر ربانی، شمیم طارق کے علاوہ متعدد مبصرین اخبارات و رسائل میں تواتر کے ساتھ تبصرے لکھ رہے ہیں۔

تبصرہ نگاری کی ابتدا میں تبصرہ اور تقریظ کو مماثل قرار دیا جاتا تھا اس ضمن میں سرسید کی ترتیب کردہ ''آئین اکبری'' پر غالب کی تقریظ کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بحث تبصرہ نگاری کی تعریف کے حوالے سے غیر متعلق ہے۔ کیونکہ تقریظ نگاری تبصرہ نگاری سے قدر مختلف ہے۔ تقریظ پہلے لکھی جاتی ہے اور کتاب کے ساتھ شائع ہوتی ہے اس کے برعکس تبصرہ بعد میں لکھا جاتا ہے اور الگ سے شائع ہوتا ہے۔

تبصراتی ادب کی بات کریں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کی طباعت وصحافت کے ذریعے ہی تبصرے نے ادب میں قدم رکھا۔ تعلیمی بیداری کے سبب طباعت وصحافت کو خوب ترقی ملی اس لیے تبصرہ اور صحافت کو ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم تصور کیا جاتا ہے۔

رضوان اللہ فاروقی ادیب، شاعر اور صحافی ہونے کے ساتھ ایک اچھے تبصرہ نگار کی حیثیت سے بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے درجنوں تبصرے لکھے۔ اپنی وفات سے کچھ ہی دن پہلے تمام تبصروں کو یکجا کر کے ''تبصرات کتب'' (2022) کے نام سے شائع کرایا۔ اس کتاب کو مبصر نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں وہ تبصرے شامل

ہیں جو رضوان اللہ فاروقی کی کتابوں پر دیگر مبصرین نے تبصرے رقم کیے ہیں۔اور دوسرے حصے میں ان تبصروں کو شامل کیا ہے جو دیگر مصنفین کی کتابوں پر مرتب یعنی رضوان اللہ فاروقی نے بقلم خود تحریر فرمائے ہیں۔ان کے یہاں مختصر اور طویل دونوں طرح کے تبصرے ملتے ہیں۔کتاب میں شامل پہلا تبصرہ معروف صحافی سہیل انجم کی کتاب ''قومی آواز: جدید اردو صحافت کا معیار'' پر رقم کیا گیا ہے۔یہ تبصرہ 9 صفحات پر مشتمل ہے جسے طویل تبصروں کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔تبصرے کی ابتدا افسانوی انداز میں کی ہے اور قومی آواز سے وابستہ دیگر صحافیوں کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ قاری کی معلومات میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔اس کے علاوہ قومی آواز کی مختلف اشاعتوں کے تعلق سے گفتگو اس انداز میں کیا ہے کہ قومی آواز کا سفر اور اس دوران نکلنے والے دیگر زبانوں کے اخبارات کے تعلق سے بھی بہت ساری معلومات فراہم ہو جاتی ہے۔آخری صفحہ پر کتاب ''قومی آواز: جدید اردو صحافت کا معیار'' کے چاروں ابواب پر مختصراً روشنی ڈالتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ:

> ''آخر میں پس نوشت کے زیر عنوان ''قومی آواز'' کی ویب سائٹ کا تذکرہ کرتے ہوئے سہیل انجم ''سنڈے نیشنل ہیرالڈ'' اور ''نوجیون ویکلی'' کے اجرا کی خبر دیتے ہیں۔دیکھنا ہے کہ ہفتہ وار ''قومی آواز'' کے اجرا کی بشارت کب سناتے ہیں۔''
>
> (تبصرات کتب،ص:105)

''تبصرات کتب'' میں 'کتب صحافت کی بازدید' کے عنوان سے شامل تحریر قابل توجہ ہے۔اس میں انھوں نے مختلف کتب پر مختصر تبصرے لکھے۔ان تبصروں کی خاص بات یہ ہے کہ ان کتب کا موازنہ اپنی کتاب ''کلکتہ میں اردو صحافت'' سے کیا ہے۔سب سے پہلے پروانہ ردولوی کی تصنیف ''اردو صحافت کا استغاثہ'' میں زبان و بیان کے تعلق سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''میں نے زبان و بیان میں نہایت احتیاط سے کام لیا،لیکن وہ بالکل شمشیر برہنہ نظر آتے ہیں۔''

آگے مزید لکھا ہے:

''مثالیں پیش کرنے میں میں نے قدر احتیاط سے کام لیا ہے۔لیکن پروانہ صاحب نے ہر احتیاط کو طاق پر رکھ دیا ہے۔ایک بات اور ہے وہ یہ کہ کلکتہ میں اردو صحافت کا کینوس قدر محدود تھا اور تنوعات بھی نہیں تھے لیکن پروانہ صاحب کے لیے دہلی کا کینوس بہت وسیع اور رنگا رنگ تھا۔'' (تبصرات کتب،ص:108)

اسی طرح پروفیسر فضل الحق کی کتاب ''اردو ماس میڈیا'' سید عاشور کاظمی کی ''بیسویں صدی کے اردو اخبارات و رسائل مغربی دنیا میں'' اکثر مقامات پر اپنی تصنیف سے موازنہ کرتے ہوئے جس انداز سے تبصرہ کیا ہے اسے تبصرے کی مختلف قسموں مثلاً تعارفی تبصرے،تنقیدی تبصرے،تحقیقی تبصرے،تشریحی وتعبیری تبصرے میں تقابلی تبصروں کی حیثیت سے شامل کیا جا سکتا ہے۔

کمال احمد صدیقی کی تصنیف ''ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل کی زبان'' کا مختصر تعارف کراتے ہوئے موضوع اور مواد کو بہت سلیقے سے پیش کیا ہے۔اس ضمن میں انھوں نے لکھا ہے:

''یہ کتاب بڑی حد تک ہندوستان میں ریڈیو نشریات کا احاطہ کرتی ہے۔جہاں تک ٹی۔وی نشریات کا تعلق ہے اسے پچھلی صدی کے آخری عشرہ میں ابتدائی دور ہی کہنا چاہیے۔کیونکہ اس کے بعد کے دو عشروں میں ٹیکنا لوجی کی ترقیاں اپنے ساتھ ساتھ زبان کو بھی آسمان کی بلندیوں کی طرف لے جا رہی ہیں۔تاہم ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے نشریاتی زبان کے فن کو جن بلندیوں تک پہنچا دیا ہے وہ بلا شبہ نشان راہ ہیں۔'' (ایضاً،ص:113)

اس کے علاوہ ''ابلاغیات'' جو ڈاکٹر شاہد حسین صدیقی کی تصنیف ہے،کا مختصر تعارف کرایا ہے۔اور مختلف انشائیوں کا ذکر کرتے ہوئے اختتام پر کتاب کے محاسن کو اس طرح بیان کیا ہے کہ کتاب پڑھنے کا تجسس مزید پیدا ہو جاتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ہندوستانی صحافت کی تاریخ، اخباروں اور صحافتی تحریروں کے حوالے دوسری متعلق کتابوں میں ملتے ہیں۔ جہاں تک فن صحافت کا تعلق ہے ڈاکٹر شاہد حسین کی یہ تصنیف ایک مکمل نصاب ہے۔'' (ایضاً،ص:116)

''اردو صحافت ترجمہ اور ادارت'' مصنف سید ضیاء اللہ ''حیدر آباد میں اردو صحافت'' مصنف طیب انصاری اور سہیل انجم کی ''بازیافت''، ''میڈیا روپ اور بہروپ''، ''مغربی میڈیا اور اسلام'' اور'' میڈیا اردو اور جدید رجحانات'' وغیرہ کتب پر مختصر اور جامع تبصرہ کیا گیا ہے۔

گر بچن چندن کی کتاب'' اردو صحافت کا سفر'' پر تبصرے کی ابتدا کچھ ان الفاظ میں کیا ہے:

''کتاب کا ٹائٹل ہی اس امر کا غماز ہے کہ اردو صحافت کا سفر ترقی کی طرف جارہی ہے۔ یہ کتاب معلومات کا خزانہ تو ہے ہی خاص بات یہ ہے کہ بہت ساری معلومات دستاویزی حیثیت رکھتی ہیں جو شواہد کے حوالوں کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ یہ کام چندن صاحب کے ہی بس کا ہے۔'' (ایضاً، 121)

اس تبصرے میں مبصر نے کلکتہ سے شانتی رنجن بھٹا چاریہ کی مثال دے کر گر بچن کا موازنہ کیا ہے۔اس کے بعد کتاب میں شامل مضامین کا تعارف اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کی قرأت کرتے ہوئے قاری کے سامنے ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کی تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مبصر نے ماضی کی صحافت سے روشنی لے کر حال پر روشنی ڈالی اور مستقبل کا ادراک رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''پہلے دور میں حکومت کی مشنری اردو زبان اور صحافت کے تئیں غیر متعصب اور غیر جانب دار تھی اب ایسا نہیں ہے۔ شرارت پسند اور تخریبی عناصر چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے جرائم کا ارتکاب کر کے بے خوف گھومتے ہیں۔ان کا مقابلہ کرنا قلم کاروں کے بس کی بات نہیں ۔اس طرح بالکل بدلے ہوئے حالات

میں نئی بصیرتوں کی ضرورت ہے۔ جہاں تک اردو صحافت کے مستقبل کا تعلق ہے چندن صاحب نے جن اندیشوں کا اظہار کیا ہے وہ بالکل بجا ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی تصنیف منفرد ہے۔'' (ایضاً، 123)

ڈاکٹر امام اعظم کی کتاب ''اکیسویں صدی میں اردو صحافت'' پر طویل اور معلومات افزا تبصرہ ہے۔ چند مضامین کا جائزہ لیتے ہوئے تمام مضامین پر مختصراً گفتگو اس انداز سے کیا ہے کہ تمام مضمون نگاروں اور مضامین سے واقفیت بہم ہو جاتی ہے۔ اس تبصرے میں انھوں نے اپنے وسیع المطالعہ ہونے، طویل تجربے اور مشاہدے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ مثلاً کتاب میں شامل مضمون ''اردو میں زرد صحافت'' کے تعلق سے بہت مفید اور کارآمد گفتگو کرتے ہوئے 'زرد صحافت' کے مفہوم کو واضح کیا ہے۔

حقانی القاسمی کے موضوعاتی مجلّے ''انداز بیان'' کے سلسلہ نمبر ا۔ ''خواتین کی خود نوشت سوانح'' پر نو(۹) صفحات پر مشتمل ایک تبصرہ لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے اقتباسات نقل کرتے ہوئے کتاب کی اہمیت اور اس کی افادیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ غیر جانب داری اور بے باکی سے کام لیتے ہوئے کتاب کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ تقابل کی فضا اس تبصرے میں بھی قائم ہے۔ پنجابی مصنفہ اجیت کور کی ''خانہ بدوش'' پڑھنے کے بعد مشہور رقاصہ سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پنجابی مصنفہ اجیت کور کی ''خانہ بدوش'' پڑھتے ہوئے مشہور رقاصہ اساڈورا ڈنکن Isadora Duncan یاد آگئیں جنھوں نے اپنی آپ بیتی My Life میں لکھا ہے کہ'' آج تک کسی عورت نے اپنی زندگی کی صداقت ظاہر نہیں کی۔ مشہور عورتوں کی خود نوشت سوانح عمریوں میں ان کے ظاہری وجود کا حساب کتاب ملتا ہے۔۔۔ نشاط اور کرب کے عظیم لمحوں سے سب کی سب حیرت ناک طور پر خاموش ہیں۔'' اگر اساڈورا اجیت کور کی خود نوشت پڑھ لیتیں تو شاید انھیں اپنی بات میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوتی۔'' (ایضاً، ص:136)

یہاں ان کے دیگر مضامین مثلاً رحمت یونس کا بعنوان ''خودنوشت کا فن'' پر بے لاگ تبصرہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ اسے پڑھ کر قاری کتاب پڑھنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔تبصرے میں تاریخی پس منظر میں جاتے ہوئے ملک کے مختلف معاشرتی نظام اور خواتین کی حالت اوران کے ساتھ کیے جانے والے سلوک خاص طور سے خاتون کا خاتون کے ساتھ سلوک پر بے باک اظہار خیال کیا ہے اور ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ بھی کیا ہے جوآج کی صداقت سے بے حد قریب ہے۔تبصرے کے اختتام پر لکھا ہے:

''حقانی صاحب نے حکایات وشکایات جرم کی جو داستانیں پیش کی ہیں وہ دلچسپ ہیں۔ اور انھیں سینۂ گل کے گواز (دروں) تک پھیلنے کی سعی نا تمام پر کسی قدر اطمینان ہونا چاہیے۔ (ایضاً،ص:141)

صحافی رضوان اللہ فاروقی نے امریکن سفارت خانے کے دفتر اطلاعات سے شائع ہونے والے جریدے ''اسپین'' پر بھی تبصرہ لکھا ہے۔مبصر نے خود ''اسپین' کے انگریزی مضامین کے ترجمے کی ذمے داری کو بخوبی انجام دیا ہے اور بقول سہیل انجم ۲۷۲ مضامین کے ترجمے کیے ۔اس تبصرے میں انھوں نے جریدے کی ظاہری و باطنی خوبیوں پرروشنی ڈالی ہے۔

ماہ نامہ حجاب اسلامی کے خصوصی شمارے ''فیملی کونسلنگ'' پر ایک طویل تبصرہ لکھا ہے۔سہیل انجم کی کتاب پر تبصرے ''باز دید حرم'' ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی کی ''دبستان شبلی کی فارسی خدمات'' کے ابواب اور مضامین کا بھر پور تعارف پیش کیا ہے۔ساتھ ہی اس کے حسن وقبح اوراس کی اہمیت وافادیت کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے:

''مصنف نے اس کتاب کی تصنیف کے دوران شب وروز مطالعہ کے سوا اور کچھ نہ کیا ہوگا لیکن ان کی اس کاوش نے اس کتاب کو بلکہ اس کے ہر باب کو ایک تحقیقی

مقالے کی حیثیت دے دی ہے۔ جو اس راہ میں تحقیقی کام کرنے والے کے لیے رہنما بن سکتا ہے۔'' (ایضاً،ص:162)

فاضل مبصر نے کتاب کی خامیوں کی نشان دہی کر کے کچھ مشورے اور اپنی ذاتی آرا سے بھی نوازا ہے۔مثلاً ایک جگہ پروف ریڈنگ کی اغلاط سے متعلق لکھا ہے کہ:

''یہ نہایت اہم نکتہ ہے اس پر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔''

(ایضاً،ص:168)

کتب ''تاریخ بنگالہ (بزبان فارسی)''یادوں کا سفر''،''سخنورانِ اعظم گڑھ'' (کتاب میں شامل سب سے طویل تبصرہ) مولانا اظہر غوری کی تصنیفات پر تبصرے بھی موضوع اور مواد کا تعارف بہت سلیقے سے کرایا ہے اور اس میں عام بول چال کی لفظیات کا بھر پور استعمال بھی کیا ہے۔

رضوان اللہ فاروقی نے اپنی اہلیہ (مرحومہ) کی بھانجیوں کی کتابوں پر تبصرے سپردِ قلم کیے ہیں۔کتابوں کے نام ''جن جنجال میں''،''گیدڑ بھبکیاں''،''پڑیئے گر بیمار''، ''خاطر داریاں'' اور ''مجرم کے بال'' ہیں۔مبصر کی خود کی دختر ڈاکٹر زہرہ خاتون کی تین کتابوں پر بھی تبصرے کیے ہیں۔کتاب ''نقش ثانی'' اور ابتدائی اردو گرامر'' پر تبصرے بہت مختصر ہیں۔''نقش ثانی'' پر لکھے تبصرے میں اشتہاری تبصرے کی جھلک نظر آتی ہے۔ ''نصابِ تصوف'' پر جو تبصرہ لکھا ہے وہ بہت طویل ہے۔ ہر باب پر مختصر مگر جامع گفتگو کی گئی ہے۔مختلف اقتباسات بھی پیش کیے گئے ہیں جس سے کتاب کی اہمیت پر بھر پور روشنی پڑتی ہے لیکن دیگر قلم کاروں کی کتابوں پر تبصرے کی طرح ڈاکٹر زہرہ خاتون کی کتاب ''اودھ کے فارسی گو شعرا'' میں مصنفہ کا تعارف کراتے ہوئے ''اودھ کے فارسی گو شعرا'' جیسی تصنیفات کے سلسلے کو جاری رکھنے کا جواز بھی پیش کیا ہے۔تبصرے کا خاتمہ ان کلمات پر کیا ہے جس سے طلبہ کتاب کے مطالعے کی طرف راغب ہوں۔انھوں نے لکھا ہے:

''فارسی ادب و تاریخ کے طلبہ کے لیے یہ کتاب ایک مفید حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔'' (ایضاً،ص:174)

صحافی رضوان اللہ فاروقی کے تبصروں کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے یہاں مختصر اور طویل دونوں قسم کے تبصرے ملتے ہیں۔تبصرے کی طوالت کے بارے میں کوئی حتمی معیار قائم کرنا ممکن نہیں۔طوالت کا انحصار کتاب کے معیار، مباحث کی افادیت، صداقت بیان، اور اسلوب بیان پر ہوتا ہے۔موصوف کے تبصرے الفاظ اور اسلوب کے وسیلے سے تخلیقات کے مزاج تک پہنچتے ہیں ۔ان کے کچھ تبصرے تحقیقی تبصروں کے زمرے میں رکھے جا سکتے ہیں کیونکہ انھوں نے تاریخی حقائق پر کھ کر ان کی صحت و عدم صحت سے بحث کی ہے۔مبصر کا مقصد چونکہ کتاب کی عمومی حیثیت کو اجاگر کرنا ہوتا ہے اس لیے مبصر نے کئی تبصروں میں کتاب میں پیش کیے گئے مباحث وافکار کی بھر پور تشریح و توضیح پر توجہ دی ہے۔

ان کے تبصرے سرسری اور روایتی نہیں ہیں۔بیشتر تبصرے جامع اور مبسوط ہیں۔ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زیر تبصرہ کتب کو لفظ بہ لفظ بغور پڑھا ہے اور غیر جانب داری سے معروضی انداز میں اس کے حسن و قبح دونوں کی نشان دہی کر کے قاری کی صحیح سمت میں رہنمائی کی ہے۔ان کے یہاں توازن و تناسب، اعتدال اور ٹھہراؤ ہے۔ہلکی پھلکی تنقید کا رنگ و روغن بھی چڑھا ہوا ہے۔ان کی آرا ایک مخصوص فکری سمت کی نشاندہی کرتی ہیں۔جس سے ان کی مبصرانہ حیثیت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔

■❖■

رضوان اللہ صاحب: کچھ یادیں کچھ باتیں

عبداللہ خالد فیصل، نئی دہلی

ایک مسافر تھا کچھ دیر ٹھہرا یہاں
اپنی منزل کو آخر روانہ ہوا
بات کل کی ہے محسوس ہوتا ہے یوں
جیسے بچھڑے ہوئے ایک زمانہ ہوا

میری پہلی باقاعدہ ملاقات محترم رضوان اللہ صاحب سے 2005یا2006 کے آس پاس ہوئی۔ لیکن میں ان کو دعوت اخبار کے آفس میں اخلاص صاحب (سب ایڈیٹر سہ روزہ دعوت) کے پاس آتے جاتے دیکھا کرتا تھا، یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بی اے کررہا تھا، انگلش پڑھنے کے لیے اخلاص صاحب سے سہ روزہ دعوت میں جاتا تھا۔ اسی دوران محترم کو دیکھا کرتا تھا۔ دراز قد، چھریرہ بدن، سفید قمیض اور سفید چوڑا پائجامہ، ہاتھ میں چھڑی لیے، تیز تیز قدموں سے موصوف اخلاص صاحب سے ملاقات کرنے آتے تھے۔ تب میں ان سے واقف نہیں تھا، لیکن میرے حافظے میں ان کا یہ حلیہ محفوظ تھا۔ پھر جب بعد میں روزگار کے لیے ہاتھ پیر مارنا شروع کیا تو، معلوم نہیں

کیسے ان کو میری خبر ہوئی، اور وہ 'اسپین' میگزین کے لیے مجھ سے کمپوزنگ کرانے لگے۔ شروع شروع میں تو بس معاملات کی حد تک تعلقات رہے۔لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان تعلقات میں کافی گہرائی آ گئی۔ پھر تو موصوف کا مجھ سے ایک جذباتی واسطہ ہوگیا۔شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہوگا جب وہ صبح چہل قدمی کرنے کے لیے آئیں اور مجھ سے ملے بغیر واپس چلے جائیں۔

ان کا معمول تھا کہ صبح دس گیارہ بجے کے قریب چھڑی لے کر نکلتے اور مرکز جماعت اسلامی یا آس پاس کے علاقے میں کچھ دیر چہل قدمی کرنے کے بعد میرے آفس میں آ کر بیٹھ جاتے اور پھر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوجاتا بعض دفعہ یہ سلسلہ طویل ہوجاتا اور ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے تک چلتا رہتا، وہ اپنے زندگی کی واقعات اور تجربات مجھے سناتے رہتے۔ میں بھی بخوشی غور سے ان کی باتیں سنتا رہتا، واقعات ہی اتنے دلچسپ ہوتے کہ کام چھوڑ کر ہمہ تن گوش ہوجاتا۔ان کی سوانح حیات ''اوراقِ ہستی'' کے آدھے سے زیادہ واقعات میں موصوف کی زبانی سن چکا تھا۔موصوف کے اہم واقعات میں ان کا کانپور میں داخلہ، اس کے بعد بنارس میں کچھ وقت کے لیے ملازمت، ریلوے میں ملازمت، کلکتہ میں اخبارات میں مترجم وصحافی کی حیثیت سے کام کرنا جس کی تفصیل کے لیے باقاعدہ ایک کتاب کی ضرورت ہے، پھر دہلی میں 'اسپین' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے تقرر، ملازمت کے دوران ہی دل کا عارضہ لاحق ہونا، ریٹائرمنٹ اور اس کے بعد فری لانس ترجمہ کرنا وغیرہ وغیرہ یہ تو کچھ بڑے بڑے واقعات ہیں جن کا میں نے ذکر کیا،فہرست کافی طویل ہے۔

جب علمی موضوعات پر گفتگو کرتے تو معلوم ہوتا کہ ایک علم کا سمندر ان کے اندر موجزن ہے جو ٹھاٹھیں مار کر باہر آنے کے لیے بے چین ہے، اکثر فارسی اشعار سناتے اور ترجمہ کرکے مفہوم سمجھاتے، ساتھ ساتھ ہی کوئی لطیفہ یا مزاحیہ قصے بھی سناتے رہتے۔ تجربات

کا ایک بحرِ ذخار تھے۔ ایک دو بظاہر معمولی سے تجربے میں ذکر کرتا ہوں جن کی بظاہر کوئی اہمیت نہیں ہے، لیکن میرے حافظہ میں وہ ہمیشہ گردش کرتے رہتے ہیں۔

عمر کے آخری دنوں میں زیادہ تر گفتگو کا موضوع بیماری رہتا تھا وہ خواہ اہلیہ محترمہ کی ہو یا خود اُن کی۔ اسی دوران باتوں باتوں میں ذکر کرنے لگے کہ بتائیے تکلیف کا احساس دن کے مقابلے رات میں زیادہ کیوں ہوتا ہے؟ میں خاموش رہا، سوچتا رہا ہے۔ پھر خود ہی بتانے لگے کہ یہ اصل میں سورج کی جو کرنیں/روشنی ہوتی ہیں ان میں بیماری سے لڑنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اسی لیے دن میں ہمیں تکلیف کا احساس کم ہوتا ہے اور جب سورج غروب ہوجاتا ہے اور ہم ان کرنوں یا سورج کی روشنی سے دور ہوجاتے ہیں، تو تکلیف میں اضافہ محسوس ہوتا ہے اور پھر صبح میں دھیرے دھیرے جیسے جیسے سورج زمین کے قریب آنے لگتا ہے ہمیں سکون محسوس ہوتا ہے اور اس تکلیف میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے۔

ایک دن گھٹنوں کے درد پر بات چل رہی تھی، فرمانے لگے اکثر لوگ گھٹنے کے اوپری حصے پر جو ہڈی ہوتی ہے جسے 'پالی' کہتے ہیں، اس پر تیل یا مرہم لگاتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ اگر وہ تیل یا روغن گھٹنے کے پیچھے پٹھوں پر لگائیں تو جلدی اور زیادہ آرام ملے گا، وہاں سے روغن یا تیل جلد اثر انداز ہوگا، اوپر لگانے سے تو وہ ہڈی پر ہی رہ جاتا ہے۔

ہماری باتوں کا کوئی موضوع متعین نہیں تھا، جس موضوع پر بھی چاہے گفتگو کرتے تھے، بالکل بے تکلف دوستوں کی طرح، اپنے دل کی باتیں مجھ سے شیئر کرتے تھے۔ ایک روز اپنا معمول بتانے لگے کہ میں صبح سویرے اٹھتا ہوں، خود چائے بناتا ہوں، پھر اہلیہ کو جگا کر انھیں چائے، بسکٹ دیتا ہوں، (اہلیہ دو تین سال سے صاحبِ فراش تھیں) وہ کسی اور سے چائے لینے کو تیار نہیں ہوتیں، اس لیے یہ ذمہ داری میری ہی ہے۔ میں یہ ان کی باتیں سنتا رہتا اور سوچتا رہتا کہ اتنی ضعیفی میں وہ اپنی اہلیہ کا کتنا خیال رکھتے ہیں، جس عمر میں کوئی شخص

دوسروں کا محتاج ہوتا ہے اُس عمر میں وہ اپنی اہلیہ کی خدمت کرتے اور بڑے خلوص کے ساتھ کرتے۔ دوسروں کو تکلیف نہ دینا چاہتے تھے، کہتے: ''طارق میاں (نواسے جو موصوف کے ساتھ رہتے تھے) ڈیوٹی سے آتے ہیں، تھکے ماندے رہتے ہیں، کوئی کام بتانا اچھا نہیں لگتا۔ ان کی بھی اپنی مصروفیات ہیں۔'' غرض موصوف کی کوشش یہ ہوتی کہ جتنا ہو سکے اپنا کام خود ہی انجام دیں، حالانکہ طارق بھائی نہایت نیک، شریف اور فرمانبردار ہیں۔ میں ذاتی طور پر ان کو جانتا ہوں نہایت ملنسار، خوش اخلاق شخصیت کے مالک ہیں۔

پیسے کے لین دین میں موصوف کا معاملہ بالکل الگ تھا، دینے میں جلدی کرتے تھے، لینے میں اس کے بالکل برعکس، جس نے جو بتادیا اس کو وہ ادا کردیا، کبھی مول تول نہیں کیا۔ پندرہ-سترہ سال کی مدت میں کبھی بھی ہمارے درمیان پیسے کو لے کر کوئی ناخوشگواری نہیں ہوئی۔ جب بھی کسی کتاب کا پروگرام ہوتا، مسودہ میرے حوالے کردیتے اور پہلے پرنٹ کے ساتھ ایڈوانس ادا کردیتے۔ میں منع بھی کرتا کہ کام تو ہوجانے دیں، تب حساب کرلیں گے۔ لیکن محترم اصرار کرکے کہتے یہ رکھ لیجیے حساب کتاب تو ہوتا رہے گا۔

اپنی اسی عادت کی وجہ سے انھوں نے کافی نقصان بھی اٹھایا، ایک بڑے پروجیکٹ پر انھوں نے کام کیا، جس کا پیمنٹ نہیں ہوا، کام کروانے والے انتقال فرما گئے، ان کے ورثاء میں سے کسی نے کوئی دلچسپی نہیں لی، نتیجتاً رضوان اللہ صاحب کی کل رقم ڈوب گئی۔

ایک بات اور جو میں نے محسوس کی وہ یہ موصوف کی ماشاء اللہ پانچ بیٹیاں تھیں، جن میں سے ایک بیٹی کا انتقال ان کی حیات میں ہی ہوگیا تھا۔ اولادِ نرینہ کوئی نہیں تھی، لیکن بھولے سے بھی انھوں نے کبھی اولادِ نرینہ سے محرومی کا شکوہ نہ کیا۔

طبیعت ناساز ہونے سے تقریباً دس دن پہلے میری ان سے ملاقات ہوئی تھی، ایک فارسی نظم ''محبت چیست'' کی کمپوزنگ کے سلسلے میں، تب تک ایسا وہم و گمان میں بھی

نہیں تھا کہ آپ سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکے گی۔ لیکن اللہ کی مشیت میں کسی کو کوئی دخل نہیں۔ بالآخر ان کے انتقال کی خبر سنی۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون!

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ محترم کے درجات کو بلند کرے اور ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

■❖■

رضوان دادا

محمود فاروقی
معروف داستان گو، نئی دہلی

سن ۷۷ء میں جب ابو کا دوبارہ دہلی تبادلہ ہوا تو ہم لوگ بٹلہ ہاؤس کی مسجد والی گلی میں حشمت ماسٹر صاحب کے مکان میں آ کر آباد ہوئے۔سامنے مرزا فریدالحسن بیگ کا گھر تھا، جو بعد میں جامعہ کوآپریٹو بینک اور ذاکر باغ کی تعمیر کے لیے بجا طور پر مشہور ہوئے۔میں اس وقت چھ سات سال کا تھا اور مسعود مجھ سے دو سال چھوٹا، دونوں دیوسماج میں پڑھتے تھے جو ان دنوں خیموں اور تمبوؤں پر مشتمل ایک زیرِ تعمیر اسکول تھا۔اکثر رات کو کھانا کھا کے ہم لوگ ابو امی کے ساتھ جوگابائی کا سنسان علاقہ پار کر کے ذاکر نگر جاتے تھے رضوان دادا سے ملنے۔ یہ میری پہلی یاد تھی ان سے ملاقات کی۔ بھرا پرا گھر تھا ان دنوں، جن کے وہ کرائے دار تھے بعد میں وہی مسعود کا سسرال بنا۔اور ان کے مکان سے ذرا ہٹ کے ذاکر نگر کے مین روڈ پر تاباں صاحب کا مکان بنا اور ان کے برابر میں عذرا رضوی اور مجیب صاحب ان کی بیٹی داماد جو پھر میرا سسرال بنا۔رضوان دادا نے بتایا، ان کی بیٹیوں نے بھی کہ کیسے بارہا انھوں نے میری اہلیہ انوشا کو تاباں صاحب کا ہاتھ پکڑے ٹہلتے

ہوئے دیکھا تھا۔ اس طرح رضوان دادا نہ صرف ہمارے ماضی کے بلکہ ہمارے مستقبل کے بھی شاہد بنے۔ دھیرے دھیرے ملاقاتوں سے یہ عقدہ کھلتا اور گہرا ہوتا چلا گیا کہ ہم جن کو جاننا چاہتے تھے، خاندان میں اور خاندان کے ان میں بہت سے لوگوں کو دادا پہلے سے اور خوبتر جانتے تھے۔

دادا کتنے جہاں دیدہ تھے یہ راز میرے اوپر بہت بعد میں آشکارا ہوا۔ جب والد صاحب تیسرے اور آخری تبادلے پر ۱۹۹۰ء میں دہلی آئے، تب تک دادا ابوالفضل انکلیو میں اپنا گھر بنا چکے تھے۔ اب کے ہم لوگ بٹلہ ہاؤس کی دوسری گلی میں مشہور عربی داں اجتبیٰ حسین صاحب کے کرائے دار بنے۔ میں کالج پہنچ چکا تھا، دادا ابھی USIS میں تھے، امریکہ، یوروپ، پاکستان وغیرہ کے کئی سفر کر چکے تھے۔ وہ اپنی سیاحت کے اور امریکی سربراہوں کے قصے سناتے، کوئر یاپار کے ہمارے بزرگوں کی کارستانیاں گناتے، خاص طور پر وہ شخصیتیں جو ہم لوگوں کے لیے تھوڑی لیجنڈری تھیں، مثلاً عذیر بڑے ابا اور ہدیٰ بڑے ابا کی رودادیں سناتے۔ اس دوران ایک بار ان کی طبیعت خراب ہوئی اور میں ہولی فیملی میں ابو کے ساتھ ان کی عیادت کو گیا تو میں نے اپنی نادانی میں ان سے یونہی پوچھ لیا کہ Do you have any Regrets?، کیا آپ کو کسی بات پر افسوس ہے؟ ظاہر ہے انگریزی میں سوال اسی لیے کر پایا کیونکہ بارہا دادا کی زبان سے انگریزی فقرے سن چکا تھا۔ دوسرے یہ کہ دادا کے ساتھ کھل کر بات کی جاسکتی تھی۔ دادا نے فوراً اور برجستہ جواب دیا No Regret۔ وہ کئی سالوں تک اس بات کا ذکر کرتے رہے کہ کیسے میرے سوال نے انھیں سوچنے پر مجبور کیا اور کیسے آخرش انہیں لگا کہ انھوں نے جواب بالکل صحیح دیا تھا۔

دادا نے زندگی میں بہت اتار چڑھاؤ دیکھے۔ حالانکہ انھوں نے اپنی پُر مشقت زندگی کا ایک دو بار رواروی میں ذکر کیا تھا۔ مگر ان کی خودنوشت 'اوراقِ ہستی' پڑھ کر ہی

مجھے ان کی غیر معمولی اور پر مصائب زندگی کا مکمل احساس ہو پایا۔ کس قدر محنت اور جانفشانی سے انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کی، اس داستان کو پڑھ کے بعض دفعہ رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مگر اہم بات یہ ہے کہ اس جانکنی اور خود کو فنا کر کے حاصل کی گئی کامیابی پر ان کے اندر بالکل بھی رعونت نہیں تھی، نہ کبھی انھوں نے بہت فخریہ انداز میں اس کا ذکر کیا۔ یہ صرف کسرِ نفسی نہیں تھی بلکہ یہ زندگی کے تئیں ان کا رویہ تھا۔ ایک فطری خوش مزاجی جس نے انہیں غم گیتی اور مایوسی سے باز رکھا۔ دادا کی جدوجہد بہت طویل تھی، تعلیم کے بعد روزگار اور معاش کے لیے بھی انہیں بہت پاپڑ بیلنے پڑے، بہت دکھ اٹھانے پڑے، بہت تکلیف اور کلفتوں کا بار اٹھانا پڑا مگر یہ سب کبھی ان کی عادات اور اطوار سے ظاہر نہیں ہوا۔ جو زخم انہوں نے جھیلے ان کا بالکل پتا نہیں دیتے تھے نہ وہ کرب ان کی شخصیت میں جھلکتا تھا۔ وہ بنیادی طور سے مکمل طور پر Self Made تھے مگر کبھی میں نے ان کے اندر کوئی غم نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی کڑواہٹ نظر آئی۔ جو اس طرح کی شدید اور لمبی جدوجہد سے گزرنے پر پیدا ہوجاتی ہے۔

شاید یہی وجہ رہی ہوگی جو انھوں نے دوسروں کو سہارا دینے میں اور اپنے عزیز و اقربا کی کفالت کرنے میں ہمیشہ پیش قدمی کی اور ہمیشہ غیر معمولی فیاضی دکھائی۔ ان کے گھر پر ہمیشہ ان کے کنبے کے لوگ موجود پائے جاتے اور یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔

دادا کی خوش مزاجی کی دلیل ان کی ایک مخصوص ہنسی میں نظر آتی تھی۔ ان کی ہنسی ایک طرح کی Chuckel تھی جو میرے ابو کی بھی شخصیت کا حصہ تھی۔ وہ بھی اسی طرح ہنستے تھے۔ دادا کا حسِ مزاح بھی عمدہ تھا اور ہنسنا ہنسانا، پُرمزاح قصوں، واقعات اور لوگوں کو یاد کرنا انہیں بہت پسند تھا۔ عذیر بڑے ابا، جو ان کے کلکتہ کے زمانے کے ساتھی تھے دو ایک بار ہندوستان آئے تو ان کے گھر ضرور جاتے۔ دادا ہمارے خاندان کے بزرگوں کی

زندگیوں کے عینی شاہد تھے اس لیے رومی اور میں اکثر کھوج کھوج کے ان سے داداؤں کے متعلق پوچھا کرتے تھے۔ میں نے جب نوجوانی میں قدم رکھا اور دوبارہ دادا سے ملاقاتیں شروع ہوئیں تب تک وہ نوکری سے سبکدوش ہو چکے تھے مگر گاہے بگاہے اپنے امریکی مالکان اور وہاں کے اپنے اسفار کا ذکر وہ کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ میں مشتاق احمد یوسفی کی مشہور زمانہ کتاب 'آبِ گم' پڑھ رہا تھا، تو میں نے ایک قصہ نشور واحدی کا سنایا مگر ان کے نام کا تلفظ غلط کر گیا تھا۔ چونکہ واحدی صاحب کا تعلق بھی کانپور سے تھا، لہٰذا دادا انہیں بخوبی جانتے تھے اور انھوں نے مزید ان کے قصے ہمیں سنائے۔

دادا بھی دیگر کوئریاپاری عزیزوں کی طرح ریٹائرمنٹ کے بعد گوشہ نشینی کو ہی فوقیت دینے لگے تھے۔ صحافت کی زندگی ختم کرنے کے بعد انھوں نے باقاعدہ ادب اور تاریخ کی دنیا میں قدم رکھا۔ خاندان کے دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی بڑے ابوشمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے گرویدہ اور قائل تھے۔ مجھے ایک دو بار شرف حاصل ہوا فاروقی صاحب کو دادا کے گھر لے جا کر ملوانے کا۔ انہیں کے مشورے پر دادا نے کلکتہ میں اردو صحافت کی تاریخ پر اپنی معرکتہ الآرا کتاب تصنیف کی تھی۔ دادا کے گھر میں اوائل زمانے سے ہی کمپیوٹر موجود رہا کرتا تھا۔ بعد میں وہ فون کے ساتھ ساتھ Tab کو بھی استعمال کرنے لگے۔ فارسی پر اچھی دسترس رکھتے تھے اور نظموں اور رباعیوں کے علاوہ ایک لمبی مثنوی بھی تصنیف کی تھی۔ ادبی حلقوں سے دوری اور پرہیز کے باوجود ادبی طور پر خود کو اس قدر مصروف اور متحرک رکھنا ایک بہت غیر معمولی کارنامہ ہے جو دادا کی شخصیت کی Idealism کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ آخر آخر عمر تک دادا ادبی طور پر سرگرم رہے اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ ان کی کتابوں میں ہمارے گاؤں ہمارے لوگ' اور 'اوراقِ ہستی' مجھے خاص طور سے پسند ہیں۔ خاص کر آخر الذکر کتاب میں دادا کی نثر غیر معمولی روانی رکھتی ہے اور ساتھ ساتھ

جذبات کی شدت نے اس میں شراب دوآتشہ کا لطف پیدا کر دیا ہے۔

شہرت اور دنیاوی کامیابی کے فقدان اور اپنی تمام تنہائی اور گوشہ نشینی کے باوجود اس طرح لکھتے چلے جانے، کام کرتے چلے جانا دراصل فقیری کے ساتھ ساتھ ایک یوگی ہونے کی نشانی ہے اور دادا یقیناً قلم کے یوگی تھے جو آخر آخر تک اپنی سادھنا میں سرگرم رہے اور ہم سب کے لیے ایک نا قابلِ عمل مثال چھوڑ گئے۔

اپنی ضعیفی، جسمانی نقاہت اور پیری کے باوجود دادا نے جس طرح دادی کا خیال رکھا، ان کی تیمارداری کی، دن رات ان کے لیے ایک کر دیے وہ ایک ایسا معجزاتی فعل تھا جس کی نظیر بہت مشکل سے کہیں ملے گی۔ ایک روایتی ازدواجی رشتے میں تقریباً 85 برس کی عمر میں رات رات بھر اپنی علیل بیوی کے ساتھ جاگنا، ان کو کھانا کھلانا، ان کے Alzherimens کے پیدا کردہ مزاجی تبدیلیوں اور چڑچڑے پن کو دن رات برداشت کرنا اور کبھی حرفِ شکایت منہ پر نہ لانا اور یہ سب سال در سال کرتے چلے جانا، یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو دادا کو عظیم بنا دیتا ہے۔ عام انسانوں سے کہیں اوپر، کہیں برتر، کہیں زیادہ غنی۔ یہ بھی ایک طرح کا یوگ تھا اور دادا جنھوں نے پوری زندگی کٹھور محنت میں گزاری تھی آخر عمر میں بھی اس جانفشانی سے اور تندہی سے خود کو اور اپنے لاغر جسم کو جھونکے رہے جیسا انھوں نے شروعاتی زندگی میں کیا تھا۔ میں ایسے کسی آدمی کو نہیں جانتا جس نے عمر کے اس پڑاؤ پر آ کر کسی کی اس طرح خدمت اور دیکھ بھال اور عیادت کی جیسے دادا نے کی۔

یقیناً دادا بہت منفرد آزاد منش اور اپنی طرح کے بڑے اور انوٹھے آدمی تھے اور ان کو دیکھنا، ان کو جاننا، ان سے ملنا میرے لیے غیر معمولی خوش قسمتی کا باعث رہا اور ان کے دکھائے ہوئے راستے پر میں چار قدم بھی چل پایا تو خود کو خوش نصیب سمجھوں گا۔ آخر میں دادا کی ہی ایک رباعی جو ان جذبات کا حاصل ہے:

چرا دیوانہ درد آشنا دیوانہ تر گردد
چرا باکاسۂ الفت شناسا در برد گردد
بہاراں یک قبائے نو برائے گلستاں آرد
خزاں چوں دشمن گلبادی شاخ و ثمر گردد
ھماں مردود نابینا صدف گوہر کجا یابی
کہ محجوب حجاب پارسا دامان تر گردد
خدا آگاہ گردد گر کسے بعد از خود آگاہی
جہان رنگ و دامش دو نگاھش ہیچ تر گردد

■❖■

میرے اچھے خالو جان

سیما صدیقی

ہندوستان کے مستند صحافی، ادیب، دانشور، محقق اور مترجم رضوان اللہ فاروقی میرے خالو جان تھے۔ وہ امریکی انفارمیشن سروس (USIS) سے منسلک رہے۔ 1986 کی بات ہے، ان کے پاکستان آنے کی خبر نے خاندان میں خوشی کی ایک لہر دوڑا دی۔ خاص طور پر میرے والدین اور چچا ریحان احمد صدیقی بہت پر جوش تھے۔ اُن کے رتبے اور مشاغل کو جان کر میرے ذہن میں ایک نہایت سنجیدہ، مدبر اور بارعب شخصیت کا تصور تھا لیکن جب ان سے ملے تو یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ پہلی بار ملے ہیں۔ ان کا رویہ نہایت دوستانہ، مشفقانہ اور مخلصانہ تھا۔ ان کی علم دوست اور باوقار شخصیت آج تک ذہن پر نقش ہے۔

وہ بہت کم دن کراچی میں رہے لہٰذا تشنگی رہی۔ میری خالہ بچیوں کی ذمے داری کی وجہ سے نہ آسکیں؛ اس کا بھی قلق تھا۔ خالو جان رات کو ٹھہرے تو ہم سب ان کی صحبت میں جاگتے رہے۔ میرے والدین اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں کے بارے میں ڈھیروں باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے ہم سے ہمارے تعلیمی سلسلے اور مشاغل کے بارے میں دریافت کیا۔ یہ میرا طالب علمی کا دور تھا۔ میری ایک کہانی تعلیم و تربیت نامی بچوں کے

رسالے میں شائع ہو چکی تھی۔ جو اسکول میں پیش آنے والے ایک واقعہ پر مبنی تھی۔ میں نے خوش ہو کر انہیں دکھائی تو انہوں نے حوصلہ افزائی فرمائی اور کہا: ''تم میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ اس کو جاری رکھو اور مشق کرو۔'' میں نے پوچھا: ''مشق سے کیا مراد ہے؟'' انہوں نے کہانی کا ایک خاکہ بعنوان ''ماسٹر صاحب'' سنایا اور کہا۔ ''اب اس پر پوری کہانی لکھو۔ سچوئشن اور مکالموں کے ساتھ۔'' دوسرا اسائن منٹ ''تیسرا کمرہ'' کے نام سے دیا۔ کہ ''ایک حکیم صاحب تھے۔ حد سے زیادہ کنجوس؛ ان کے مرنے کے بعد گھر کے پہلے کمرے سے یہ اور دوسرے کمرے سے یہ یہ سامان برآمد ہوا۔۔۔ اب سوچو کہ تیسرے کمرے سے کیا نکلا ہو گا؟'' میں نے اگلے ہی دن دونوں کہانیاں لکھ کر دکھائیں۔ بہت خوش ہوئے اور جہاں اصلاح کی ضرورت تھی وہاں اصلاح بھی کی۔

بعد میں یہ دونوں تحاریر پاکستان میں بچوں کے مقبول اور معیاری رسالے ''آنکھ مچولی'' میں شائع ہوئیں۔ ان کہانیوں کی اشاعت پر ''آنکھ مچولی'' کے مدیر ڈاکٹر طاہر مسعود کے تعریفی خط نے گویا مجھ پر لکھنے لکھانے کے دروازے کھول دیئے۔ اس کے بعد بڑوں اور بچوں کے لئے بہت کچھ لکھا جس کا سہرا خالو جان کے سر ہے۔

رفتہ رفتہ میری چھوٹی بہنوں نے بھی تحقیقی میدان میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانا شروع کر دیئے۔ ہم بہنوں کے نام کے ساتھ صدیقی نام کا لاحقہ تھا۔ ہمیں صدیقی سسٹرز پکارا جانے لگا۔ ہماری تحاریر تواتر سے بچوں کے مختلف رسائل میں شائع ہونے لگیں تو قارئین اور پبلشرز کی فرمائش پر ہم چار بہنوں کی کتب ایک ساتھ شائع ہوئیں جن میں ہماری اب تک شائع شدہ چیدہ چیدہ کہانیوں کو یکجا کیا گیا تھا۔ یہ کتب جب خالو جان کی خدمت میں ارسال کیں، تو انہوں نے ایک بھرپور تبصرہ لکھ کر حوصلہ افزائی فرمائی، جو ہماری توقعات سے بہت بڑھ کر تھی۔ ان کا تحریر کردہ ہر لفظ ہمارے لئے سند کا درجہ رکھتا ہے۔ اُن کے تبصرے کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''دخترانِ عزیز سیما سلمہا، نائلہ سلمہا، بینا سمہا اور گل سلمہا نے وہ ہجرت نہیں دیکھی جو طوفانِ نوح کی طرح ایک عظیم الشان مستحکم تہذیب کو خش و خاشاک کی طرح بہا کر لے گئی۔ بہر حال ان بیٹیوں نے عالمِ مہاجرت میں آنکھیں کھولیں۔ اپنے اسلاف کی میراث نہ ان کے والدین ساتھ لے کر گئے نہ اپنی بچیوں کے لئے چھوڑ گئے لیکن شرافتِ نفس، دین داری اور علم و دانش کی روایات اور ان کے مظاہر ان کی رگ و جاں اور ان بیٹیوں کی قلم وقرطاس سے ہم رشتگی اسی میراث نہفتہ کا حصہ ہے۔ وہ سارے عنا صر نئی مٹی اور نئی آب و ہوا میں پروان چڑھے اور وقت کے ساتھ ساتھ؛

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں

ان بیٹیوں کے نانا جان سید محبّ الحق محشر نے ادب کی تقریباً تمام اصناف میں جواہر پارے پیش کئے۔ دینی مضامین، نظم ونثر دونوں ہی اصناف میں لکھے جو ''دارالمصنّفین'' اعظم گڑھ کے ''معارف'' جیسے جرائد میں شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ طنز و مزاح پر مبنی مضامین بھی لکھے۔ ان ہی کی میراث لکھنے لکھانے کی صلاحیت کی صورت میں ان بچیوں (صدیقی سسٹرز) تک پہنچی ہے۔''

خالو جان نے بالکل صحیح کہا۔ بلا شبہ تخلیقی صلاحیتوں کا جوہر میراث کی صورت ہم سب بہنوں کو ورثے میں ملا ہے۔ مگر فطری یا پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے جس حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے وہ خالو جان کی عطا کردہ ہے۔ افسوس وہ آج ہم میں نہیں رہے۔ انہوں نے جس طرح میری لکھنے لکھانے کی صلاحیتیوں کو مہمیز کیا، میری حوصلہ افزائی فرمائی، میں اُسے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ ان کی مغفرت کی دعائیں میری ہر نماز کا حصہ رہیں گی۔ انشا اللہ!

کراچی، پاکستان مورخہ ۵/نومبر ۲۲۰۲ء

■❖■

رضوان پھوپھا: میرے معلّم، میرے راہبر

عبدالواسع
ایڈیٹر: دی فیناننشیل ورلڈ

رضوان پھوپھا کا ذکر آتے ہی ذہن 80 کی دہائی کے اوائل میں منتقل ہو جاتا ہے۔اسی دوران پہلی بار میری ان سے اوکھلا میں ملاقات ہوئی تھی، جہاں وہ ابھی کلکتہ سے شفٹ ہوئے تھے۔ میں کافی چھوٹا تھا اور ابھی اسکول جانا شروع کیا تھا۔ کچھ مہینوں یا تقریباً ایک سال کے بعد وہ جنوبی دہلی کے ہی ذاکرنگر علاقے میں آ گئے جہاں ہم لوگ پہلے سے رہتے تھے۔ یہیں پر مجھے ان سے باقاعدگی سے ملنے کا موقع ملا۔ صبح اسکول جاتے ہوئے رضوان پھوپھا سے اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ فارمل لباس میں آفس جاتے تھے۔ ہاتھ میں ایک لیدر کا بیگ بھی ہوتا تھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی بس بٹلہ ہاؤس سے لیتے تھے۔ دوپہر میں روزانہ میری والدہ مجھے اسکول بس سے لینے کے بعد نجمہ پھوپھی کے پاس جاتی تھیں۔ رضوان پھوپھا کے یہاں جب بھی شام کو جانا ہوا، میں نے انہیں پڑھتے یا لکھتے پایا۔ وہ اپنی ملائم آواز میں میرے سلام کا جواب بہت گرمجوشی سے دیا کرتے تھے اور میری خیریت بھی پوچھتے تھے۔

80 کی دہائی کے اوائل میں ٹیلی ویژن زیادہ عام نہیں تھا۔ یہاں تک کہ دہلی میں

بھی بہت کم لوگوں کے گھروں میں ٹی وی سیٹ ہوا کرتا تھا۔ رضوان پھوپھا ان میں سے ایک تھے۔ اس وقت کے واحد ٹی وی چینل دور درشن پر بچوں کے پروگرامس دیکھنے ہم پابندی سے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔

میں نے کبھی بھی رضوان پھوپھا کو ٹیلی ویژن دیکھتے نہیں پایا سوائے، ان موقعوں کے جب وہ خود اس کی اسکرین پر نظر آتے تھے۔ یعنی جب ان کے انٹرویوز ٹیلی کاسٹ ہوتے۔ ہوسکتا ہے وہ کسی وقت خبریں دیکھتے ہوں، لیکن میں نے انہیں ایسا کرتے نہیں دیکھا۔ تاہم، میں نے انہیں برسوں بی بی سی اردو کی شام کی نشریات پابندی اور اہتمام کے ساتھ سنتے دیکھا۔ کمرے میں اس وقت مکمل خاموشی چھائی ہوتی تھی۔ انہوں نے بظاہر آخری وقت تک بی بی سی اردو کی خبریں سننے کا اپنا معمول جاری رکھا۔ وہ روزانہ کئی انگریزی اور اردو اخبارات بھی پڑھتے تھے۔

1990ء میں ہم دونوں ابوالفضل انکلیو میں رہنے لگے۔ ہمارے گھر صرف ایک گلی کے فاصلے پر تھے۔ یہاں مجھے انہیں اور قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ میں پابندی سے ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ 1992 میں جب میں 12ویں جماعت کا امتحان دے رہا تھا تو میں ان کے گھر پڑھنے جاتا تھا، کبھی کبھی وہ بھی گھنٹوں اسی کمرے میں بیٹھ کر کچھ لکھتے رہتے تھے۔ یہیں سے ہم نے مزید بات چیت شروع کی۔ اسی دوران انہیں معلوم ہوا کہ شروع سے انگلش میڈیم میں پڑھنے کی وجہ سے میں اردو اچھی طرح نہیں لکھ پاتا۔ انہوں نے مجھے امتحانات کے بعد ملنے کو کہا۔ اردو زبان سکھانا انہوں نے شروع سے شروع کیا اور تقریباً دو ماہ کے اندر مجھے اچھی خاصی اردو لکھنا آ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے کی کلاس میں ہر روز اُن سے حالاتِ حاضرہ سمیت کئی دوسری معاملات پر بھی بات ہوتی تھی۔

وہ ہمیشہ ایک سبجیکٹ کو کئی تناظر میں دیکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے سکھایا کہ جب کسی تحریر، رپورٹ، اداریہ، یا معروف میڈیا ہاؤس کی طرف سے شائع یا نشر کیے جانے

والے ریڈیو یا ٹیلی ویژن کی خبروں کی بات آئے تو ہمیشہ سطح کے نیچے کیسے دیکھا جاتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ میرے پہلے چند مضامین اس وقت کے ملک کے معروف اردو اخبارات میں شائع ہوئے۔قومی آواز، دعوت، اخبارِ مشرق سے لے کر منصف تک۔ جبکہ میں بچپن سے کانوینٹ اسکولوں میں پڑھا تھا۔شروع میں وہ نہ صرف میری تحریر چیک کرتے تھے بلکہ اکثر اپنے مضامین کے شائع ہونے کی خبر بھی مجھے انہی سے ملتی تھی۔

میں نے میڈیا میں اپنے لیے جو بھی تھوڑی بہت جگہ بنائی ہے، وہ ان کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے مجھے سکھایا کہ کسی موضوع کو مختلف زاویوں سے کیسے دیکھا جاتا ہے۔ انہوں نے مجھے تنقیدی انداز میں سوچنا سکھایا۔ میں نے ان سے سیکھا کہ کیسے شائستہ لیکن ثابت قدم رہنا ہے۔اگر میں کسی کو لکھنے یا انٹرویو کرنے سے پہلے مناسب ہوم ورک کرتا ہوں تو اس کا کریڈٹ بھی ان کی تربیت کو جاتا ہے۔

جرنلزم میں تین دہائی گزار چکا ہوں۔اس دوران میں نے دنیا بھر کے تقریباً دو درجن ایڈیٹرز کے ساتھ کام کیا ہے۔ میں سیکڑوں دانشوروں اور بیوروکریٹس سے ملا ہوں۔ لیکن میں نے کبھی ایسا شخص نہیں دیکھا جس کی یادداشت رضوان پھوپھا جیسی ہو۔ وہ انتہائی پیچیدہ باتوں کو آسان الفاظ میں سمجھا سکتے تھے۔انہیں وقت، دن تاریخ سب زبانی یاد ہوتا تھا۔مثال کے طور پر ایک بار انہوں نے کہا:

> ''کیا تمھیں 1943 کے بنگال کے قحط کے بارے میں پتا ہے؟ ایک اندازے کے مطابق 60.3 ملین کی آبادی میں سے 800,000 سے 3.8 ملین بنگالی بھوک، ملیریا اور غذائی قلت، آبادی کی نقل مکانی، غیر صحت بخش حالات اور صحت کی دیکھ بھال کے فقدان کی وجہ سے حکومتی پالیسیوں، جنگ سمیت دیگر عوامل کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔''

میں نے بات سنتے سنتے فون کے انٹرنیٹ پر چیک کیا۔ بنگال کے قحط کے بارے

میں کہی ہوئی ان کی ہر بات درست تھی۔

انھوں نے مزید کہا: ''اس دوران، ایک دن، دراصل اتوار کے دن بہت گرمی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ کانپور میں جولائی کا مہینہ ہمیشہ گرم رہتا ہے۔ اگر مجھے صحیح طور پر یاد ہے تو یہ 11/جولائی تھا۔ میں نے اپنے کالج کے ایک دوست سے ملاقات کی ...''

اور انہوں نے اپنی بات مکمل کی ... میں پھر انٹرنیٹ پر گیا.. پتا چلا کہ واقعی 11 جولائی 1943 کو اتوار تھا۔

ذاکر نائک جیسے خطیب بھی، میرے خیال میں، ایک مسودہ بناتے ہیں، عوام میں تقریر کرنے سے پہلے اسے کئی بار دیکھتے ہیں۔ رضوان پھوپھا جیسا حافظہ دنیا میں بہت کم لوگوں کا ہوتا ہوگا۔

ایک دفعہ میں کمرے میں بیٹھا ہوا تھا، وہ کسی سے بات کر رہے تھے۔ اس شخص نے ان سے پوچھا، ''آپ امریکہ اور ہندوستان کی معیشتوں کا موازنہ کیسے کریں گے؟'' میز پر امریکن ایمبیسی سے شائع ہونے والے اسپین میگزین کی کاپی اور ایک ہندوستانی اخبار پڑا تھا۔ انہوں نے ایک امریکی گائے اور ایک ہندوستانی گائے کی تصویر دکھائی۔ امریکی گائے صحت مند اور بڑی تھی جبکہ ہندوستانی گائے بہت کمزور اور دبلی تھی۔ پھوپھا نے ان سے کہا: ''یہ فرق ہے۔''

انہوں نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد کئی اہم کتابیں لکھیں۔ مضبوط حافظے کی وجہ سے انھیں زیادہ ریسرچ نہیں کرنی پڑتی تھی۔ چند مہینوں میں ہی پوری کتاب تیار ہو جایا کرتی تھی۔ وہ خود ایک زندہ انسائیکلوپیڈیا تھے۔ کئی بار، میں بعض موضوعات پر بات کرنے کے لیے ان کے پاس جاتا۔ وہ کسی بھی موضوع پر ہمیشہ خوشی خوشی دیر تک بات کرتے۔ کبھی کبھار وہ کہتے کہ وہ اس موضوع کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے اور اس

کے بعد اس بارے میں کافی دیر تک سمجھاتے رہتے۔ کئی بار تو ایک گھنٹے سے زیادہ گزر جاتا۔ وہ علم کا سمندر تھے۔ ان کے جیسی حیرت انگیز شخصیت پر لکھنے کے لیے ایک مضمون کافی نہیں ہے۔ ان کی شخصیت کے مختلف عناصر کو اجاگر کرنے کے لیے چند کتابوں کی ضرورت ہوگی۔ میں اب بھی یقین نہیں کر پاتا کہ وہ نہیں ہیں۔ ہمیں ان جیسے مزید اساتذہ اور رہنماؤں کی ضرورت ہے جو نوجوانوں کو پالش کر سکیں اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے سہارا، حوصلہ اور اعتماد دے سکیں۔

■❖■

دادا

مشہود فاروقی، بنگلور

دادا مجھ سے عمر میں پچاس سال بڑے تھے۔ دس پندرہ سال پہلے تک جب میں ان سے کہتا تھا کہ دادا یہ کریئے یا کوشش کیجیے تو کہتے تھے کہ جب تم ہماری عمر کو پہنچو گے تب دیکھنا کہ یہ سب کرنا کتنا آسان ہے اس کے باوجود دادا نے سب کیا۔ میں ان سے لکھنے کے لیے ہی کہتا تھا اور آخر تک دادا کی تخلیقی قوت اپنا جوہر دکھاتی رہی۔ دو مہینے پہلے ہی انھوں نے ایک طویل فارسی نظم ''بہارِ خزاں رسیدہ'' فون پر بھیجی تھی۔

دادا سے میری قربت یہی پندرہ بیس سالوں میں ہوئی۔ یوں تو میری ملاقات ان سے سن ۱۹۹۰ء کی شروعات سے ہو رہی ہے لیکن وہ براہِ راست نہیں تھی۔ میرے والد ان کو چچا کہتے تھے اور یہ رشتہ مجھے بہت دنوں بعد دادا نے ہی سمجھایا کہ تمہارے پردادا اور میرے ابا سگے چچا زاد بھائی تھے۔ رشتوں کا مانجھا مجھ سے جلدی سلجھتا نہیں۔ پوری چرخی کھولنی پڑتی ہے تب بات سمجھ میں آتی ہے لیکن دادا کے مشاق ہاتھوں سے یہ علم میں نے خوب حاصل کیا۔

غالبًا افریقہ کے کسی ملک کی ایک کہاوت ہے کہ جب کوئی بوڑھا شخص انتقال کرتا ہے تو مانوں ایک پورا کتب خانہ ضائع ہو جاتا ہے۔ دادا ایک نہیں پچاسوں کتب خانوں کا

مجموعہ تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس میں سے کئی تحریری صورت میں شائع ہوئی ہیں اور ہم باقی زندگی دادا سے ہم کلام رہ سکتے ہیں۔

میں اس وقت سوچ رہا ہوں کہ میں دادا سے کیوں ملنے جاتا تھا، اس کا جواب کوئی مشکل نہیں لیکن صرف ایک وجہ بھی نہیں ہے۔ وہ ہمارے لیے سب سے بزرگ ہستی تھے۔ ان کی دعائیں لینا ہماری خوش قسمتی تھی۔ دوسرے ان کی محبت، جس اخلاص سے وہ ملتے تھے، وہ فطری تھا۔ اور لگتا تھا کہ کچھ دیر کے لیے ہم بھی ماضی میں چلے گئے۔ پھر ان سے خاندان کے بزرگوں کی باتیں سننا، ان کی آنکھوں سے دیکھے منظر جب الفاظ بن کر نکلتے تھے تو لگتا تھا کہ ہم بھی وہاں ہیں جہاں کا بیان ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں اگر ان کی تصانیف سے میں کچھ اقتباس نقل کروں تو بات مکمل ہوگی۔

''یہ بات دسمبر ۱۹۴۸ء کی ہے کرسمس کی ایک دن کی چھٹی کے آگے پیچھے اتوار پڑ گیا تھا اس طرح دو روز کی چھٹی ہوگئی۔ ایسے میں بھلا گھر جانے سے میں کب باز رہنے والا تھا لیکن اے ڈی ایم صاحب نے حکم صادر کر دیا کہ چھٹیوں میں باہر نہ جانا شاید اسی اثناء میں لکھنؤ سے کوئی ضروری جی او آئے تو اس کا فوراً جواب دینا ہوگا لیکن میں کہاں ماننا حسبِ معمول ہفتہ کے آخر میں مئو جانے والی الہ آباد ایکسپریس پکڑی اور گھر چلا گیا۔ دوسرے دن رات کو حسبِ معمول واپسی کے لیے روانہ ہوا۔ دسمبر کا مہینہ دس بجے رات کا وقت اوس کی وجہ سے تاریکی اور گاڑھی ہوگئی تھی۔ میرے ساتھ گاؤں کے ایک صاحب بھی تھے اور ایک مزدور تھا جس نے میرا سامان لے رکھا تھا۔ رات کو گیارہ بجے کے قریب ہم لوگ دریا کے کنارے پہنچے تو کشتی نہیں تھی، وہ دوسرے کنارے پر تھی۔ بہت آواز لگائی لیکن کوئی ملاح گھر سے نہیں نکلا۔ بالآخر میں نے کپڑے اتارے اور دریا میں چھلانگ لگا دی۔ تیر لیتا تھا لیکن دریا میں تیرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ کنارے پہنچ کر بھی

کشتی نہیں نظر آ رہی تھی۔ خیر وہ تو مل گئی لیکن اس کو کھینے والا بانس اس میں نہیں تھا۔ میں نے اختر بھائی کو آواز دی تو انھوں نے بتایا کہ ملاح اس کو مٹر کے کھیت میں ڈال دیتے ہیں تو میں نکل کر اوپر کھیت میں گیا وہ بانس تلاش کر کے لایا، پھر کشتی کو اس پار لایا تو سب سے پہلے کپڑے مانگ کر خود کو لپیٹا پھر کشتی کو لے کر دوسری طرف آیا، وہ بانس اور کشتی دریا میں یونہی چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے کیوں کہ ریل گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ دوڑتے دوڑتے ہم لوگ ٹرین کے ساتھ ہی اسٹیشن میں داخل ہوئے اور اگلے دن صبح کو میں ڈرا سہا دفتر پہنچا۔ و لے بخیر گزشت۔'' (ہمارے گاؤں، ہمارے لوگ، ص ۱۱۴-۱۱۵)

دادا کی سوانح ''اوراقِ ہستی'' کسی بھی قاری کے لیے بے حد دلچسپ کتاب ہے۔ اس کتاب میں آزادی سے پہلے کا کانپور، مشرقی یوپی، اور آزادی کے ٹھیک بعد کا کلکتہ اور اردو صحافت پر جتنی معلومات ہیں اتنی بہت کم دوسری کتابوں میں نظر آئے گی۔ کانپور اور کلکتہ کے فسادات کا آنکھوں دیکھا حال درج ہے۔ دادا کردار نگاری میں بھی استاد تھے۔ ''اوراقِ ہستی'' بہت سے یادگار شخصیتوں کا بہی کھاتہ ہے۔ ایک للّن بھائی کے بارے میں دادا لکھتے ہیں:

''وہ پیسے پر خزانے کے سانپ کی طرح بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ بقول شخصے ان کے دروازے پر نہ کبھی کسی نے ایک بتاشا کھایا نہ ایک بیڑا پان کا۔ انھوں نے نہ کبھی کسی کا ختنہ عقیقہ کرایا نہ اپنے علاوہ کسی کی شادی بیاہ کے چکر میں پڑے۔ ان کی خوش قامتی کرتے پاجامے اور ایک عدد ٹوپی کے علاوہ کسی بار کی متحمل نہ ہوئی اور ان کی پاپوش پالش کے لیے زندگی بھر ایڑیاں رگڑتی رہ گئی۔''

یومِ آزادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو بنارس سے بھٹنی تک اسٹیشنوں کی سجاوٹ کے سامان جو ریلوے کی طرف سے فراہم کیے گئے تھے میں نے تقسیم کیے۔ ہم لوگوں نے اپنے

انجن کو بھی سجانے کی کوشش کی تھی، کیلے کے پورے پورے درخت دونوں طرف باندھے گئے جو بنارس سے بھٹنی تک کے سفر میں ہی سوکھ کر جھناٹا ہوگئے۔ ۱۴راگست کو صبح دس بجے جو بھٹنی گیا تو رات کو دس بجے واپس آیا بہت تھک گیا تھا سوگیا۔''

دادا کہتے تھے کہ کوریا پاری فاروقیوں میں ایک بات پائی جاتی ہے کہ وہ عموماً خوش شکل ہوتے ہیں، مجھے لگتا ہے کہ اگر ساتھ میں خوش مزاجی اور ظرافت کو بھی جوڑ دیا جائے تو کوئی غلط بیانی نہیں ہے۔ آخر تک ہنسی کی پھل جھڑی چھوڑتے رہے۔ ساتھ میں بہت سے غموں سے بھی پالا پڑا۔ آدمی لمبی عمر جیتا ہے تو اس کا خمیازہ بہت سے لوگوں کو الوداع کہہ کے کرنا پڑتا ہے۔ دادا نے بھی اپنے بھائیوں، اہلیہ اور ایک بیٹی کو پہلے جاتے دیکھا، لیکن زندگی سے ناطہ کبھی نہیں توڑا اور جب خود گئے تو اتنی خاموشی سے، جیسے بیٹھے بیٹھے بس آنکھ لگ گئی ہو۔ دادا، آپ کی آواز اور آپ کی باتیں ہمارے کانوں میں تاحیات رہیں گی۔ خدا آپ کی روح پر اپنی رحمتوں کا سایہ رکھے۔ آمین!

■❖■

میرے ابو

زہرہ خاتون

ٹھہر ٹھہر ذرا علمی کی بات بھی سن لیں
یہ راز دانِ معانی رہے رہے نہ رہے
(رضوان اللہ)

سیمیناروں، کانفرنسوں سے متعلق مضامین لکھنا اور کسی ایسی شخصیت کے بارے میں لکھنے کے لیے قلم اٹھانا جس نے خود مجھے قلم پکڑنا سکھایا ہو ایک مشکل امر ہے، میں نے کئی مرتبہ ان کی کتابوں پر تبصرے کیے یا جو کچھ وہ لکھنے کو کہتے میں لکھ لیتی۔ البتہ ان کے سامنے پیش کرنے کی جسارت مشکل سے ہوتی کیونکہ ہر صفحہ میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی لفظ قابلِ گرفت نکل ہی آتا، کچھ نہیں تو 'کا، کی، کے' کی غلطیاں، کبھی الفاظ کی تذکیر و تانیث، یہ بھی نہیں تو کومہ، فل اسٹاپ کا جا، بے جا استعمال۔ ایسے موقعوں پر میں اس انتظار میں رہتی کہ ان کی توجہ ذرا ہٹے تو ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں تا کہ میری تحریری خامیاں براہِ راست میرے سامنے نہ آئیں، بعد میں ان کی درستگی ہوتی رہے گی۔ آج ان کے گزر جانے کے بعد اتنا بڑا خلاء ہو گیا ہے کہ کسی بھی لمحہ اس جانب سے توجہ نہیں ہٹتی۔

آج اس تحریر کا موجب وہ تمام تحاریر، خاطرات، تاثرات اور لوگوں کی محبتیں ہیں

جو ابو (میں نے اپنے والد کو بچپن سے اسی نام سے پکارا) کی ذات سے وابستہ تھیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد اندازہ ہی نہیں تھا کہ ان کے کتنے زیادہ مربی اور مخلص دوست احباب ہیں، جنھوں نے کبھی اپنی گفتگو سے تو کبھی اپنی تحریروں سے ان کے خلوص کو سراہا اور تسلی بخش کلمات سے مجھے صبر کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔ ہندوستان کے تقریباً سبھی مؤقر اخبارات میں ابو کے گزر جانے کی خبریں آتی رہیں اور رُلاتی رہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ابو کو کہاں سے واپس لے آؤں اور انہیں بتاؤں کہ دیکھئے آپ کے کتنے ماننے، جاننے والے موجود ہیں جو آپ کی کمی کو محسوس کر رہے ہیں۔

اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ابو نے ایک بہترین زندگی گزاری، گرچہ آپ کی تمام زندگی قدم قدم پر بے حد مشقتوں اور سختیوں سے دوچار رہی۔ جن کا مفصل تذکرہ ''اوراقِ ہستی'' میں موجود ہے۔ اس کتاب میں ابو نے زندگی کے تمام نشیب وفراز کو یکجا کر کے قارئین کے سامنے رکھ دیا۔ گھر کا بڑا بیٹا ہونے کے ناطے کنبہ پروری کے ساتھ ساتھ آج کل کے حالات میں پانچ بیٹیوں کی پرورش، بہترین تعلیم و تربیت نیز انہیں ازدواجی رشتوں سے منسلک کرنا، دہلی جیسے شہر میں اپنے لیے مختصر سہی لیکن مستقل رہائش گاہ کا انتظام، ان تمام امور کی انجام دہی ایک مشکل امر تھا جسے انھوں نے بہ حسن وخوبی ادا کیا۔

کرونا جیسی آفاقی وبا جس نے تمام دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا، لوگوں کو خود اپنے گھروں میں مقید ہونے پر مجبور کر دیا تھا، ابو بے چارے، جن کا آنا جانا پہلے ہی محدود تھا، مزید قید ہو کر رہ گئے۔ والدہ بھی سال بھر پہلے اس دارِ فانی سے رخصت لے چکی تھیں۔ لہٰذا تنہائی میں ایک انسان جو ہمہ وقت حرکت میں رہنے کا عادی ہو اپنا وقت کس طرح گزارے اور اس کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔ اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ میں ان کی اس الجھن کو محسوس کر رہی تھی۔ صرف یہی ایک مسئلہ نہیں تھا بلکہ دور نزدیک کسی نہ کسی دوست یا عزیز واقارب کے گزرنے کی خبریں بھی وقتاً فوقتاً آ رہی تھیں، زیادہ دور جانے کی

ضرورت نہیں، اسی سال کے وسط میں پہلے ہمارے سب سے چھوٹے چچا فیضان اللہ فاروقی جو ابو کے برادرعزیز بھی تھے اور قریب بھی، اسی آفاقی وبا کا شکار ہو کر خالقِ حقیقی سے جا ملے اور سال کا آخر آنے تک پہلے اردو دنیا کی معروف شخصیت شمس الرحمٰن فاروقی اور آخری تاریخ میں مجھ سے بڑی میری بہن زبیدہ اپی، جنھوں نے ابو اور امی دونوں ہی کی بے انتہا خدمت کی وہ بھی اس دنیا سے مختصر علالت کے بعد رخصت ہو گئیں۔ ابو کے لیے یہ صدمے جان لیوا تھے، لیکن انھوں نے بڑے تحمل اور ضبط سے کام لیتے ہوئے مالک دوجہاں کے فیصلوں کے آگے سر جھکا دیا اور اُف تک نہ کیا۔ غرض کہ ابو کو ذہنی طور پر مصروف رکھنے کے لیے تدبیر سوچی گئی کہ کیوں نہ ابو کو کچھ لکھنے پڑھنے میں مصروف کیا جائے۔ پھر میں نے اصرار کیا کہ وہ اپنی سوانح لکھ ڈالیں جس کے کچھ حصے ابو نے وقتاً فوقتاً نوٹس کی شکل میں یکجا کر رکھے تھے۔ کافی ردّ وقبول کے بعد بالآخر ابو راضی ہو گئے اور ایک مفصل زندگی نامہ جو 488 صفحات پر مشتمل ہے لکھ ڈالا۔ بیچ میں کبھی جب طبیعت میں اکتاہٹ محسوس کرتے تو کہتے ''ارے یہ تم نے کہاں پھنسا دیا۔'' 2020ء میں یہ کتاب شائع ہوئی جس کی تمام اہلِ علم حضرات نے بے حد ستائش کی۔ اس کے بعد ابو نے سختی سے عہد کیا کہ اب کچھ نہیں کرنا ہے، لیکن کیا کیا جائے ان کی طبیعت ہی کچھ اس طرح کی تھی کہ خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اکثر دوست احباب اپنی کتابیں مطالعہ اور تبصرے کے لیے دے جاتے اور پھر ابو ہاں، نا کر کے جستہ جستہ مطالعہ شروع کر دیتے، ان پر تبصرات بھی تحریری شکل میں آ ہی جاتے۔ اگرچہ ادھر نگاہیں کافی کمزور ہو گئی تھیں۔ آنکھوں میں موتیا بین کی شروعات ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر آپریشن کا مشورہ دیتے لیکن انھوں نے ڈاکٹروں کے پاس جانے سے ہمیشہ گریز کیا۔ چھوٹی موٹی تکلیفیں دور کرنے کے لیے ہومیو پیتھک دواؤں کا سہارا لیتے۔ ابو کو ہومیو پیتھک دواؤں کا اچھا خاصا تجربہ تھا، اگر کہیں کوئی معاملہ طول پکڑتا نظر آتا تو اپنے بھائیوں سے تبادلہ خیال کرتے۔ دراصل میرے دو چچا مطیع اللہ فاروقی اور ثناء اللہ فاروقی

دونوں ہی ہومیو پیتھک کے اچھے ڈاکٹر رہے ہیں۔ بات اگر ہومیو پیتھک سے آگے بڑھتی نظر آتی تو محلے کے دو معروف ڈاکٹروں، ڈاکٹر مسرور اور ڈاکٹر موتی لال کی خدمات حاصل کرتے اور اس طرح گاڑی پھر پٹری پر آجاتی۔ پڑھنے پڑھانے کے معاملے میں اِدھر میگنی فائن گلاس (خوردبین) کا سہارا لینے لگے تھے۔ اخبارات کی سرخیاں اسی کی مدد سے اِدھر اُدھر کرکے دیکھ لیا کرتے۔

اخبارات کا انتظار انہیں علی الصباح شروع ہوجاتا۔ اردو میں راشٹریہ سہارا اور انگریزی میں ''ہندوستان ٹائمز'' منگواتے تھے۔ اگر کسی روز اخبار آنے میں تاخیر ہوتی تو بے چین ہوجاتے۔ اچھے دنوں میں ریڈیو سے بی بی سی کی نشریات بغور سنتے اور اس دوران کسی قسم کی مداخلت پسند نہ کرتے۔ ٹی وی سے کبھی کوئی خاص شغف نہیں رہا، البتہ موبائل کی آمد نے انہیں ایک مرتبہ پھر میڈیا سے جوڑ دیا تھا۔ شام کو مغرب بعد موبائل میں اپنے من پسند کلپس سنا کرتے۔ جن میں بیشتر سیاسی ہوتے۔ ادبی پروگرام کا شغف بھی جاری رہتا۔ نظم یا نثر کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ فارسی زبان وادب سے ابو کو شروع سے ہی خصوصی دلچسپی رہی، اگر کوئی اچھا پروگرام ہوتا تو اس کا لنک مجھے ضرور بھیجتے۔ مولانا روم کے خاص گرویدہ تھے۔ ''دیوان حافظ'' فارسی شعراء میں ان کا پسندیدہ دیوان تھا، اکثر ان کے مطالعہ میں رہتا۔ بیشتر اشعار ازبر تھے۔ مجھ سے اکثر تفریحاً کہتے کہ مجھے اپنے شعبہ سے فارسی میں ایم اے کروادو۔ میں جانتی تھی کہ عملاً یہ ممکن نہیں تھا، چنانچہ میں بھی ہنس کر جواب دیتی کہ ''ضرور کرلیجیے۔'' دراصل ابو نے اپنے گریجویشن کے دوران اختیاری مضمون کے طور پر فارسی زبان کی کلاسیں کیں تھیں اور اس زبان سے تعلق کی بنا پر شوقیہ اس کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ علامہ اقبال کے تمام فارسی کلام کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کیا تھا۔ اقبال کی کلیات فارسی ان کے شیلف میں سامنے ہی رکھی ہوتی جسے انھوں نے خود بہت شوق سے کتابی میلے کے دوران ایرانی بک اسٹال سے خریدا تھا۔ ان کے وقت کی رضا زادہ شفق کی ''تاریخ

ادبیات ایران'' آج بھی میرے پاس شکستہ حالت میں موجود ہے۔ کلکتہ میں سروس کے دوران کبھی کبھی وہ ''ایران سوسائٹی'' بھی چلے جایا کرتے تھے جہاں فارسی زبان کے جدیدلب ولہجہ سے روشناس ہونے کی کوشش کرتے، اس زمانے میں ایران سوسائٹی کے روح رواں پروفیسر اسحٰق صاحب کے زیرنگرانی فارسی جدید کی کلاسیں بھی منھ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر اٹینڈ کرتے۔ ابو کو اردو، انگریزی کے علاوہ فارسی زبان پر بھی یکساں قدرت حاصل تھی۔ شعروشاعری کا ذوق رکھتے چنانچہ جہاں اردو اور انگریزی میں اشعار کہتے وہیں فارسی میں بھی ہلکے پھلکے انداز میں بے حد معنی خیز نکتے بیان کرجاتے۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے عروض کا کوئی علم نہیں، پتہ نہیں کیسے باوزن اشعار کہہ جاتے۔ جہاں کہیں کچھ شک وشبہ محسوس ہوتا تو ہمارے چچا میاں فیضان اللہ سے تبادلۂ خیال کرتے۔ چچا کو علم عروض پر پوری طرح دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے یہ علم مجھے بارہا سکھانے کی کوشش کی لیکن یہ میری کم نصیبی رہی کہ میں ان سے نہ سیکھ سکی۔

ادھر گزشتہ ڈیڑھ سالوں سے ابو کی توجہ قرآن کریم کے تراجم اور ان کی تفاسیر کی جانب زیادہ تھی۔ عربی زبان بھی تھوڑا تھوڑا سیکھنے کی کوشش کررہے تھے۔ انگلش تراجم کا دیکھنا اور تفاسیر کا مطالعہ کرنا، آج کل وہ اسی مہم پر لگے ہوئے تھے۔ انٹرنیٹ سے کئی ایک پرنٹ نکلوا کر مطالعہ کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ جنہیں وہ تھوڑا تھوڑا کرکے دیکھتے۔ والدہ کے گزرجانے کے بعد بیڈ کے آدھے حصے پر ان کی کتابیں، لیٹر ہیڈ، پین، موبائل، ٹیب، تسبیح اور خوردبین یہ چیزیں رکھی ہوتیں جن میں ترتیب کا (ہماری نگاہ میں) کوئی خیال نہ ہوتا، لیکن اگر کسی نے اسے ترتیب دینے کی کوشش کی تو اس سے ناراض ہوجاتے، کہتے کہ ''جو چیز جہاں، جیسے رکھی ہے، ایسے ہی رہنے دو۔'' ایسے میں اکثر میں ہی ان کے عتاب کا نشانہ بنتی، کیونکہ باقی لوگ مجھ سے زیادہ ہوشیار تھے، وہ یہ جسارت ہرگز نہ کرتے۔

راتوں میں اکثر بےخوابی کی شکایت کرتے اور جب نیند نہ آتی تو بقول ان کے

''اشعار آتے''۔ چنانچہ جب ورود ہوتا تو وہ اندھیرے میں ہی کسی کاغذ پر قلم چلا لیتے اور کچھ نوٹ کر لیتے۔ صبح ہونے پر تحریر اور مصرعے دونوں کو درست کر لیتے۔ ''اوراقِ ہستی'' مکمل ہونے کے بعد پھر ایک سوال درپیش تھا کہ اب کیا کریں؟ یوں تو کرنے کے لیے بہت سے کام تھے لیکن اب ان کا ذہن آہستہ آہستہ کمزور ہو چلا تھا۔ اور یادداشت بھی۔ آنکھوں سے زیادہ پڑھنے پر پانی جاری ہونے لگتا۔ کانوں سے بھی کچھ اونچا سننے کی شکایت لاحق ہوتی۔ دانت اس عمر میں بھی تمام سلامت تھے لیکن کمزوری اور ضعیفی کے سبب نوالہ چبانے میں دقت ہوتی۔ لہٰذا غذائیں اب محدود ہو گئیں تھیں۔ کوئی مقوی غذا لیتے تو ہاضمی نظام اسے برداشت کرنے سے قاصر رہتا۔ چلنا پھرنا نہ ہونے کے سبب گھٹنوں کی تکلیف بھی شروع ہو گئی قصہ مختصر یہ کہ تمام اعضاء گویا جواب دے رہے تھے۔ ان حالات میں کچھ ہلکا پھلکا کام کرنے کی تجویز زیرِ غور تھی۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ ابو اپنی کتابوں اور دوسروں کی کتابوں کے جو تبصرے انھوں نے لکھے ہیں، انہیں یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کروائیں۔ یہ تجویز ابو کو پسند آئی اور وہ فی الوقت اس کام میں مصروف ہو گئے۔ وفات سے چند ہفتہ قبل یہ کام بھی اختتام کو پہنچا۔ اور تبصرات کتب مطبوعہ شکل میں آ گئی۔ اسی دوران ایک اور تجویز بھی زیرِ بحث تھی اور وہ یہ کہ ان کے فارسی زبان میں جو منتشر اشعار یا نظمیں، غزلیں، قطعات و متفرقات ہیں، انہیں ترتیب دے کر ایک کتابی شکل عطا کی جائے۔ لیکن ابو اس بات کے لیے راضی نہیں ہو رہے تھے۔ شاید انہیں کچھ کمتری کا احساس لاحق تھا کہ ان کے فارسی اشعار اس پایہ کے نہیں ہیں، جنھیں زیورِ طباعت سے آراستہ کیا جائے۔ اگرچہ انہیں اپنا فارسی کلام اردو کلام کی بہ نسبت زیادہ عزیز تھا۔ مجھے ان کے فارسی قطعات بہت پسند ہیں۔ میں اپنی ہر تصنیف کی شروعات ان کے دعائیہ فارسی قطعات سے کرتی اور اسے فال نیک جان کر اپنے کام کا آغاز کرتی۔ اس طرح ان کی اور میری کتابوں کے قطعات خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ جستہ جستہ اشعار متفرقات کی

صورت میں موجود ہیں، جو وقتاً فوقتاً انھوں نے کہے یا کہیں کسی کاغذ پر نوٹ کر لیے یا براہِ راست فون پر میسیج کر دیے۔ چند دعائیہ اشعار تو ایسے ہیں جن کی بے حد پذیرائی ہوئی۔ ابو کے مخلص دوست اسم بامسمی پروفیسر محسن عثمانی صاحب نے ان اشعار کو ایک کتابچہ کی صورت میں چھپوا کر دوست احباب میں نہ صرف تقسیم کیا بلکہ ایک مختصر اور جامع دیباچہ بھی اس میں شامل کیا۔ ایک اقتباس اسی کتابچہ سے ملاحظہ ہو:

> ''پیش نظر فارسی مناجات یا 'التجا' منظوم ہے او رایسے شخص کے قلم سے ہے جسے انگریزی، اردو و فارسی تینوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہے اور تینوں زبانوں میں ان کی نگارشات اور تصنیفات موجود ہیں۔ اردو صحافت کی اہم شخصیتوں میں ان کا شمار ہے۔ عام طور پر صحافی ادیب نہیں ہوتے ہیں لیکن وہ ایسے صحافی ہیں جن کا ذوق ادب بہت بالیدہ ہے۔''

خیر کافی بحث وتکرار کے بعد میں نے اُن کو اس بات کے لیے راضی کرلیا کہ وہ اپنے فارسی کلام پر ایک مختصر مقدمہ لکھ دیں۔ اور انھوں نے لکھ کر مجھے دے دیا کہ اب باقی کام تمہارا ہے۔ شاید قدرت کو بھی یہی منظور تھا، واقعی اب یہ باقی ماندہ کام مجھے ہی کرنا ہوگا۔ کوشش تو یہی ہے کہ جہاں دوست احباب اور عزیز واقارب کے تاثرات اور ابو سے وابستہ تمام تحریری یادوں کو یکجا کیا جارہا ہے وہیں کتاب کا ایک حصہ ان کے فارسی کلام کے لیے مختص ہو۔

یہ ایک عجیب وغریب اور حیران کن حقیقت ہے کہ ابو بنیادی طور پر ایک جید صحافی تھے۔ تمام عمر میدانِ صحافت ہی ان کی جولان گاہ رہی، لیکن جب ان کی ادبی نگارشات پر نگاہ ڈالیں تو وہ خاصی وقیع نظر آتی ہیں۔ خاص طور پر ان کا منفرد اندازِ بیان، جس میں ہلکا پھلکا، طنز ومزاح بھی شامل ہوتا۔ الفاظ کا برمحل انتخاب جس کے لیے وہ بعض دفعہ کئی کئی فرہنگ کھنگال ڈالتے جب تک مطمئن نہ ہوجاتے جملوں کی ساخت اور قطع و برید کا سلسلہ جاری رہتا۔ اپنی تحریروں پر کئی مرتبہ نظر ثانی کرتے۔ شوخی وظرافت یہ صرف ان کی تحریری

خصوصیات نہیں بلکہ بات چیت کے دوران بھی اکثر وہ ایسے برجستہ جملے کہہ جاتے کہ سامنے والا لا جواب ہوجاتا۔ ان کی تصنیفات میں جس طرح کی پختہ اور رواں زبان ہمیں دیکھنے کوملتی ہے اور اپنی بات کہنے کا ایک منفرد سلیقہ نظر آتا ہے، لگتا ہی نہیں کہ مصنف کا تعلق صحافت جیسے کسی خشک پیشہ سے رہا ہوگا۔ مجھے ان کے خاکے بہت پسند ہیں۔ میں نے کئی کئی مرتبہ ان کا مطالعہ کیا ہے اور ہر مرتبہ پہلے ہی جیسا لطف آتا ہے۔ میں اکثر ان کے سامنے اپنی تحریروں کی بے ربطگی کا ذکر کرتی تو مجھے کافی دیر تک سمجھاتے اور ساتھ ہی مطالعہ کی کثرت پر زور دیتے جو کہ میرے اندر ایک بڑی خامی ہے۔

نثر کی طرح نظم میں بھی ان کے اشعار ان کی مہارت کا مظہر ہیں۔ سادہ اور سلیس زبان میں شعر گوئی کا فن ہر کسی کو نہیں آتا۔ یہ شوق ابو کو نوجوانی سے ہی دامن گیر ہوا۔ پہلے ابو ''علمی'' تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے ان کی پرانی تحریریں دیکھیں ان میں بیشتر جگہ علمی تخلص ہے۔ بعض ایسی بھی غزلیں ہیں جن میں علمی کاٹ کر ''رضوان'' سے ان مصرعوں کو صحیح کیا ہے۔ عمر کا بیشتر حصہ شہر کلکتہ میں گزارنے کے سبب ان کے اکثر موضوعات اسی شہر سے متعلق ملتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''اوراقِ مصور'' اس شہر سے ان کی اُنسیت و محبت اور جذباتی لگاؤ کا شاہد ہے۔

ادھر کافی عرصہ سے ضعف اور کمزوری کے باعث ابو نے سفر و سیاحت سے رخصت لے لی تھی۔ چنانچہ جہاں اپنا وطن اعظم گڑھ چھوٹا وہیں کلکتہ سے بھی ناطہ ٹوٹا۔ وہاں کے دوست احباب بھی ایک کے بعد ایک رخصت ہوئے۔ ایک سیمینار کے سلسلے میں ابھی تین سال پہلے میرا کلکتہ جانا ہوا۔ یہ شہر جسے اب کولکاتا کہا جاتا ہے میں ہر اس جگہ گئی جہاں کا تذکرہ ابو کی باتوں یا تحریروں میں دیکھا، سنا تھا۔ ان کے کئی دوستوں سے ملاقات کی، ویڈیوز بنا کے لائی۔ اس مکان کو بھی جا کے دیکھا جہاں ابو نے اپنی زندگی کے بہترین سال گزارے۔ یہ سب کچھ آنکھوں دیکھا حال ابو کو سنایا، وہ بہت خوش ہوئے گویا خیالوں

ہی میں وہ خود بھی وہاں گھوم آئے ہوں۔ یوں تو بچپن کا ابتدائی زمانہ میرا بھی وہیں گزرا، بعد میں دہلی آنا ہوا۔اُن دنوں کی میری یادیں کچھ دھندلی دھندلی سی ہیں، لیکن اس مرتبہ جب میں نے اس مکان کو جا کر دیکھا تو گزشتہ تمام مناظر ایک فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گھوم گئے، وہ چھوٹا سا مکان جس میں ہم سب نے بہترین وقت گزارا تھا، ابو نے چند اشعار بھی تحریر کیے تھے۔

ملاحظہ ہو:

تب ہم کتنے خوش تھے
چھوٹا سا اک کمرہ تھا
اور فرش پہ اس کے ٹاٹ چٹائی
دیواروں پر سے پپڑی جھڑتی
نیچی چھت پر لگتی کائی
اس میں ہاں اک لڑکی بھی تھی
تب ہم کتنے خوش تھے
محنت، قسمت، کام، مشقت
چل چل کے تھک جاتے تھے ہم
بھوکے بھی سو جاتے تھے ہم
تب ہم کتنے خوش تھے
کیچڑ پانی ٹخنوں، گھٹنوں
ملگج کپڑے، جیسے تیسے
چہرہ بھیگا، کپڑے بھیگے
اتنا پسینہ، کتنا پسینہ

پیدل، چپل، سڑکیں، گڑھے
دھوپ چمکتی، سورج سر پر
تب ہم کتنے خوش تھے
ننھے بچے پھول سے کھل کر
ہمکے اور ہمکاتے تھے جب
سوئی راتوں میں ان کے چہرے
دیکھ کے من بہکاتے تھے جب
تب ہم کتنے خوش تھے
باغ بغیچے سیر سپاٹے، قصے راجکماروں جیسے
گھر میں کیا تھا، ہم ہی ہم تھے
پریاں اور شہزادے ہم تھے
تب ہم کتنے خوش تھے
دس دس پیسے بیلے گجرے
رجنی گندھا عید ہماری
گھر کو کیا مہکاتی تھی وہ
من کو کیا بہکاتی تھی وہ
تب ہم کتنے خوش تھے
توڑ کے تارے گھر میں لائیں
کسی وحشی نے سوچا تھا تب
بیتے دن یاد آئیں یوں
کسی وحشی نے سوچا تھا تب

سوئی اک دن پیڑا اٹھے گی
کسی وحشی نے سوچا تھا تب

ابو کی اس طرح کی کئی تحریریں موجود ہیں جو کلکتہ کے بہترین دنوں کی یاد تازہ کردیتی ہیں۔ آخری کتاب ''تبصرات کتب'' آنے کے بعد ابو نے خود کہہ دیا تھا کہ بس اب یہ دفتر بند۔ میں نے کہا کہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ ابھی آپ اور لکھیں گے لیکن شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔ ابو کو آہستہ آہستہ کچھ کچھ تکلیفیں لاحق ہوتی چلی گئیں۔ اٹھنا بیٹھنا چلنا محدود ہوا۔ ایڈمٹ ہونے سے انھوں نے صاف انکار کردیا، چنانچہ اسپتال کی ضروری امداد کا گھر پر ہی اہتمام کیا گیا۔ دو دن کی مختصر علالت کے بعد ۸؍اکتوبر کی صبح ساڑھے آٹھ بجے یہ کہہ کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں کہ ''تھوڑا آرام کریں گے۔'' اور پھر واقعی اطمینان کی نیند سوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

■❖■

حصہ دوم

آہنگِ فارسی

رضوان اللہ

گفتا کہ فارسی گو، گفتم نمی توانم
گفتا کہ خامشی گیر گفتم کہ نہ در روانم
آھنگ فارسی بین آثار ما ھمین است
دارم زبان محلی آثارھم چنانم
(رضوان اللہ)

سخنی چند

عشق ایک روحانی کیفیت ہے جو عالمِ بالا سے قلبِ انسانی پر صادر ہوتی ہے۔ وہ دنیاوی قاعدے قانون سے بے نیاز ہوتی ہے، اس لیے جس قلب پر صادر ہوتی ہے اس کو بھی سارے حدود و قیود سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس قلب کی فعالیت کب، کہاں اور کس طرح ظہور پذیر ہوگی، اس کا بھی کوئی تعین نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی مثالیں شیریں و فرہاد سے لے کر منصور اور قارون تک موجود ہیں۔ لیکن اس وقت میں بات کرر ہا ہوں اس عشق کی جو تمام فطرت انسانی سے قریب ہے، ایک فرحت اور سرشاری کا موجب ہوتا ہے۔ فارسی زبان سے مجھے اسی فرحت اور سرخوشی کا احساس ہوتا ہے۔

شمالی ہند کے جس طبقہ اشراف میں میری پیدائش (۱۹۳۱ء) پرورش اور تعلیم و تربیت ہوئی اس نے سیاسی اقتدار سے محروم ہوجانے کے باوجود اپنی معاشرتی اقدار کو محفوظ اور برقرار رکھا تھا جس کے عناصر میں مذہب، زبان اور ادب کی تعلیم بطور خاص شامل تھے۔ تعلیم کی ابتدا عموماً مدارس سے ہوتی تھی جہاں تعلیمی نصاب میں بطور زبان، ایک زبان فارسی بھی شامل ہوتی تھی، آگے چل کر تعلیمی نصاب میں مضامین کی تعداد بڑھتی جاتی تو طلبہ کو مضامین کے انتخاب کی سہولت ہوتی۔ اسی مرحلہ پر فارسی یا عربی زبان کو ایک اختیاری

مضمون کے طور پر انتخاب کا موقع ہوتا۔ فارسی زبان سے ہمارے لگاؤ کا وہی نقطۂ آغاز تھا۔ رفتہ رفتہ ہم گلستان و بوستان سعدی کے اسیر ہوتے گئے اور آگے بڑھے تو حافظ شیرازی کے اسیر دام ہوئے۔ حکایاتِ سعدی کے بعض فقرے، شاہنامہ فردوسی کے چند اشعار اور مثنوی رومی کی بعض حکایات ہمارے معاشرے میں زبان زد ہیں۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے نصابی فارسی ادب کے علاوہ کچھ نہیں پڑھا۔ ادب عالیہ میرے مطالعہ میں نہیں آیا لیکن فارسی زبان، شخصیات اور ان کے نام سے وابستہ شہروں سے نادیدہ عشق ہوگیا۔ بس انہی کی زبان میں کسی کسی وقت کچھ گنگنانے لگا اور اپنی کوتاہ بینی یا عشق کی بے بصری کے سبب اس پر فارسی شاعری کا گمان ہوگیا۔ ایک زمانہ گزر جانے کے بعد جب کرنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تو خیال آیا کہ ان اجزائے منتشر کو کیوں نہ یکجا کردوں۔ چنانچہ ایک انتخاب مرتب کردیا۔ مگر اسے ''کلامِ فارسی'' کا عنوان دینے میں شرمساری محسوس کررہا تھا چنانچہ اس کے لیے ''آہنگِ فارسی'' کا عنوان تجویز کیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اس میں سے جو کچھ پڑھنا چاہوں گا فوراً مل جائے گا۔ اب اگر ایسا اتفاق ہو ہی جائے تو میں اس کی کمیوں اور کمزوریوں سے صرف نظر کرنے کی گزارش کروں گا۔

والسلام

رضوان اللہ

التجا

ترحم کن کہ بسم اللہ گویم
ترحم کن کہ الا اللہ گویم

ترحم کن کہ رحمٰن و رحیمی
ترحم کن کہ غفار و کریمی

ترحم کن کہ تو اول و آخر
ترحم کن کہ تو حافظ و ناصر

ترحم کن کہ ہو القادر قدیری
گرفتارم بلائے بے اسیری

ترحم کن کہ خیر الوارثینی
ترحم، تو الہ العالمینی

ترحم کن ترحم مستغیثم
ترحم، پا شکستہ می نشینم

تو خود لا تقنطوا گفتی بہ انساں
بساز امیدِ ما از رشتۂ جاں

کرم یا رب برائے مصطفیٰ کن
برائے فاطمہ و مرتضیٰ کن

منم فاروق زادہ کن ترحم
گرفتارم بہ گرداب و تلاطم

ثناء خوانِ عمر، صدیق و عثمان
نگاہے کن بلند از حدِ امکان

ترحم کن بہ چشم کربلا است
زمانہ شمرِ خنجر آزما است

ترحم تو برائے اولیا کن
ترحم تو برائے اتقیا کن

ترحم تو برائے انبیا کن
ترحم تو برائے اصفیا کن

گرفتارم در آتش چوں براہیم
ترحم کن چو کردی تو بہ موسیٰ
ترحم کن کہ حالم چوں زکریا
صلیبِ ظلم چوں عیسیٰ بدوشم
چوں اسماعیل خنجر برگلو ہست
نگاہے بس نگاہے تشنہ لب را
خورد کرمِ تعب روحِ درونم
ترحم کن برائے نوح، کشتی
دلے مجروح دارم چوں بہ رومیؔ
جراحت چوں نہ پابندِ جگر ہست
الٰہی تو رہانم از جراحت
چناں بودے کہ جبرائیل دیدے
ترحم برضعیفے اے خدا کن
جہاں تاریک بینم کور چشم
پرِ کاہے میانِ قعرِ دریا
منے گم گشتہ یوسف را بجویم
بہ ہر چاہے نگاہم غوطہ زن ہست
ترحم کن شبِ تاریک پیشم
ترحم کن کہ دامن پاک باشم
زبانِ من تکلم آشنا ہست

برائے او رہانم یا کریم
کہ فرعونست در پسِ پیش دریا
ترحم اے خدائے پست و بالا
چو آوازِ جرس تنہا خروشم
بلا ہا در پئے من کو بکو ہست
ترحم زم زمے، شوید تعب را
کسے ہرگز نمی داند کہ چونم
بہ طغیانے، نہ بینم کوہ جودی
ولے شکوہ بہ لب ہرگز نہ بینی
دلِ من بیں کہ چوں شق القمر ہست
کہ جانِ من ندارد صبر و طاقت
حریقِ جانِ من را بر کشیدے
بہ الطافِ فراواں ماجرا کن
نہ بینم کس بہ زیرِ سایۂ غم
گہے طوفاں گہے گرداب برپا
بخوں آغشتہ چشماں را بشویم
بہ ہر کاہے تجسس یک چمن ہست
چراغِ ما نسوزد انچہ خواہم
بدم غرقِ معاصی خاک باشم
گدایانہ ترحم آزما ہست

چو دستِ من بسوئے آسماں است　　برائے مہرِ بے حد و کراں است
بخوں آغشتہ چشمانم و مژگاں　　ترحم مدعائے نم بہ داماں
دلم مجروح سوئے آسماں دید　　خرد جوید ترحم ہم بہ امید
نگاہے کن بہ رضواں تو کریمی　　بہ حالِ خستۂ ہر کس علیمی

برائے التماسِ من بہ یزداں
دلم گفتا بگو نامش فراواں

■❖■

ترحم چیست

ترحم را چو باید فاش گفتن
برائے ابلہ شکلش صاف کردن
نہ مردِ کم نگہ داند ترحم
نہ او داند چہ شائستہ تکلم
ترحم یک دوائے دردِ پنہاں
طرب افزائے در حالِ پریشاں
بہ نومیداں شمیم کامرانی
بہ برگِ مردہ زورِ گلفشانی
بہ نابینا عصائے رہنما ہست
بہ پائے لنگ منزل آشنا ہست
ترحم کاسرِ دردِ درونے
ترحم ناصرِ پیدا وجودے
ترحم آبِ حیواں برضعیفاں
ولے شمشیر براں بر حریفاں
ترحم عاصیاں را شبنمستاں
ترحم پاک شوید داغِ عصیاں
ترحم کن کہ ردِ صد بلا ہست
ترحم کن کہ ایں امرِ خدا ہست
ترحم ارتقاعِ روحِ انساں
ترحم ارتقائے بزمِ امکاں
ترحم کہکشانِ حسنِ اخلاق
ترحم صد طلوعِ صبح و اشراق

ترحم کرد ناکس گل بداماں
صدف را کرد گوہر زا بہ نیساں

■❖■

نعت

دل و جاں تبو دادہ ام یا محمد نگاہے بہ چشمِ کرم یا محمد
چوں آید بروں از لبم اسمِ احمد فرو می رود سیلِ غم یا محمد
مقامِ تو باشد کجا در دو عالم! بہشت است زیرِ قدم یا محمد
چہ دربارِ خضرا فلک ہیچ و کمتر چہ رتبہ چہ جاہ و حشم یا محمد
گدائے بہ سنگِ درت می زندسر بہ امید شاہِ امم یا محمد
چوں بے آب ماہی ہمہ پیچ و تابم ز دوری بہ آتش تنم یا محمد
اگر گردِ کوئے مزارِ تو یابم ہماں کحلِ چشمم کنم یا محمد
پناہم توئی شافعِ روزِ محشر چوں نفسم شدہ دشمنم یا محمد
ہمہ عمرِ خود گردِ اصنام گشتم ز قیدِ صعوبت رہم یا محمد
چناں کن کہ رضواںؔ بگردد مشرف
بہ دیدار و طوفِ حرم یا محمد

■❖■

تقدیم

بادِ بہار از بہشت، آب و گِل چمن بیار
بو بگلاب می خزد، گو کہ "بیا بیا بکار"
نغمۂ نے ز نیستاں، سوزِ درونِ دلگداز
شور و فشارِ رودبار، زعم و سکوتِ کوہسار
رنگِ حنا و لالہ ریز، بیز بمستیِ عِنب
روحِ طرب ز مطرباں گیر و بیار مستعار
قامت و قبۂ شجر، سایۂ برگ سر بسر
حوصلۂ ثمروری، ذوقِ نمودِ شاخسار
کیف و نشاطِ پرفشاں رِضواںؔ میاں بیا بیا
رنگ بریز از قلم، یک بُنِ بوستاں گزار

■❖■

خضر و موسیٰ

خضر و موسیٰ بہم دگر رفتے　　یک خموش و دگر بہ او گفتے
ما کہ دمساز در سفر باشیم　　کشتی و زحتِ جاں بگر دابیم
ہم دو پابندِ حکم یک معبود　　پاسدارانِ دینِ یک مسجود
آتشے ہم دو اندروں داریم　　وَر نسوزد چنانکہ می دانیم
آتشِ تست شعلہ خو تابد　　آرے ازمن چوں اخگرے آید
خضر خاموش راہِ خویش گرفت　　شعلہ اش گو بہ خطِ نور نوشت
رہ نور دے کہ راست رو باشد　　گردشِ چرخِ چیرہ ہم شکند
آں نمی داشت مثلِ نار سرشت　　نار خاکستری کند ہر کشت
اخگرے اخگرے کہ دستش سوخت　　اخگرے اخگرے زبانش دوخت
ہم دو آتش یکے سرشت و نہاد　　تاخت ہر دو بروں زموجۂ باد
یکے روشن شدہ و روشن تر　　دیگرے جست و سوخت خانہ و در
یکے تابندہ، خوب تر تابد　　یکے بیروں جہد ز خود، خوابد
ہم دو اثباتِ سرہائے سروش　　ہمچونے یک ولے بہم بخروش
ہم دو مثلِ دل و دماغ قریں　　فصلِ ایشاں بچشمِ ظاہر بیں

یکے ساکت و دیگرے لرزد
ہر یکے اشک و خون می پوید

■❖■

دربیانِ علم

(شاعر بہ ہزیانِ مدیرِ اخبارے برافروخت وجوابش
بطورِ مکالمہ میانِ مرید وپیرصورت گرفت)

رفت افتاں تا رسد بامرشدش　　لب کشاید دربیانِ کشمکش
کشمکش بودے ''کرا گوئند علم؟''　　''از کجاو تا کجا جویند علم؟''
بر سوالش مرشدِ او شد خموش　　تا صدورِ ایں نوائے از سروش
علم دربندِ قبا مستور نیست　　پیچ وطرہ علم را منظور نیست
علم در مردِ خدا یابی اگر　　از ہمہ عالم جدا او ہم نگر
علم اورا در جہاں مشغول داشت　　درمیانِ بندگاں مقبول داشت
کارِ دنیا مبتلائے داردش　　یک نہ دو، صد ابتلائے داردش
کاش بر عالَم درِ علمش کشاد　　علم را درکارہا رہبر کناد
علم بے دانش بود دانائے کور　　پیل تن بے زور باشد مثلِ مور
مرد بے دانش پے، افکارِ خام　　برفساد آمادہ ہر گاہ و مدام
گر نمی بیند مضامیں در سیاق　　خام کارے، طفلکے با طمطراق

تیغِ کندش می درد جامہ نہ تن لعل باشد ہم زبانش در دہن
او کجا داند مقامِ عالماں آنکہ برتر از صفِ کروبیاں
حیف آں پشتارہ بردارِ کتب نے خرد افزودہ از بارِ کتب
حیف آں عالم کے مردم می گزد یعنی علمش را مزارے خود کند
انکسار از علم می یابد فراغ نے فزد از انتشارِ البلاغ
حیف فکرے خالی از پہناوری یا بزیرِ دامِ سختِ زر گری
حیف فکرِ خام تارِ عنکبوت راست گویم خام کاری را ثبوت
علم یک شعلہ کہ آہن را گداخت شعلۂ ہر سنگ دل را موم ساخت
علم از طورِ جنوں بیگانہ است از جنوں بیگانہ و فرزانہ است
پیشِ گفتار از جنوں ہشیار باش تا نہ گوئی صرفہ ہم ہُشیار باش

پس ازاں پر سید ضدِ علم چیست پردۂ بر چہرۂ آں نور کیست
در جوابش گفت اورا مردِ پیر علم را یابی بدیں سو بے نظیر
علم خود بالذات پردہ می شود چوں کسے نا اہل بردوشش برد
مثلِ نابینا کہ شمعے می برد بے تأمل زیرِ دامانش کند
دامنِ خود سوزد و بریاں کند دیگراں برحال خود گریاں کند
اے پسر گر علم داری ہوش دار تانہ سوزی دامنِ خود ہوش دار
نور را در شیشۂ محصور کن
شیشۂ دل را ازو معمور کن
گفتش ازراہِ تجسس خار چیست در زمانِ حال استعمار چیست

دی بلائے جان استعمار بود   زیرِ اثرش ہر نفس بیمار بود
لب کشائی ہمتِ مرداں نداشت   سوئے زن ایں کار بر فردا گزاشت
لب کشائی کارِ مشکل تا ہنوز   جبرِ محکم بارِ محفل تا ہنوز
تانہ گوئندہ مجاز گفتگو   تا نہ جوئندہ مجاز جستجو
تانہ فکر آزاد از بندش شود   دیوِ استبداد یکسر می گزد

او نمی داند تمدن چیست شے
مثلِ روما آتش و نیرو و نئے

■❖■

مدحت محبوب

مرحبا اے رشکِ خوباں مرحبا — مرحبا اے ماہِ کنعاں مرحبا
مرحبا رخسارِ گلگوں مرحبا — مرحبا دلدارِ بیچوں مرحبا
مرحبا اے زلفِ مشکیں مرحبا — مرحبا اے روئے سیمیں مرحبا
مرحبا اے ساق و ساعد صندلیں — مرحبا اے زلفِ شب گوں عنبریں
مرحبا اے معنی شعر و سخن — مرحبا اے موجبِ تخلیق فن
مرحبا اے نکہتِ گل مرحبا — مرحبا اے نشۂ مُل مرحبا
مرحبا شمعِ شبستان مرحبا — مرحبا روح گلستاں مرحبا
مرحبا گرمی صہبا مرحبا — مرحبا نرمئی گلہا مرحبا
مرحبا صبحِ تمنا مرحبا — مرحبا شامِ تماشا مرحبا
مرحبا اے لیلی خوابِ وصال — مرحبا اے پیکرِ حسن و جمال
مرحبا تابندگیِ چشم من — مرحبا اے راحتِ حرماں شکن
مرحبا اے نرگسِ مستانہ وش — مرحبا اے تیرِ مژگاں نیم کش
مرحبا رنگینیِ عہد شباب — مرحبا گلگونیِ جامِ شراب

مرحبا اے سود و سودا مرحبا　　مرحبا اے جنسِ عنقا مرحبا
مرحبا اے نغمۂ راحت فزا　　مرحبا اے ساحرِ کلفت ربا
مرحبا اے باعثِ گرمیِ ذوق　　مرحبا اے موجبِ سودائے شوق
مرحبا اے رونقِ دنیائے من　　مرحبا اے روشنیِ انجمن
مرحبا پیغامِ عشرت مرحبا　　مرحبا اے ماہِ طلعت مرحبا
مرحبا لب ہائے شیریں مرحبا　　مرحبا اوصافِ تمکیں مرحبا
مرحبا اے سبزۂ کشتِ امید　　زعفراں زارے زہستیش دمید
اے ندیمِ آرزو و عشق و آز　　در دلم از یاد تو پیدا گداز
شادبادا عندلیب خوش گلو
خوش ادا و خوش نوا و خوبرو

■❖■

سَحر دمید بیا بام و در کشادہ کنیم
بیا کہ قصۂ فصلِ بہار تازہ کنیم
بیا کہ خوشئہ دل جامِ ارغواں پُرکرد
بیا بیا کہ بہم باز شغلِ بادہ کنیم

■❖■

کشش و انتشار

ایں جہاں آمد پدید از انتشار　　بوئے گل یابد تعارف در بہار
انتشارِ تخمِ فصلِ نو دہد　　یا بنائے کاخ و کوئے نو نہد
ہم کشش باید میانِ انتشار　　تا نگسلد رشتہ از بُن شا خسار
از کشش پابند ہر جابیں نجوم　　انتشارِ نور بینی ہم لزوم
در کشش پیدا و پنہاں انتشار　　یک نظر شاید برائے اعتبار
گر ہوائے مرغزارے طالبی
بایدش رہوارِ خود را غالبی

■❖■

شاید بہ آسمان برندے کلامِ ما
پیش از کلام لیک برندے سلام ما
گفتا ''چہ سود؟'' جوابش چہ گوئمت؟ گو
''ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما''

رفتید ولے نہ از دلِ ما

اے دلنواز رفتی — خوش خوابِ ناز رفتی
دردِ دروں ندیدی — اے چارہ ساز رفتی
دل پارہ پارہ کردہ — آئینہ ساز رفتی
کیف و خمار و خوشبو — لطفِ دراز رفتی
خوشتر نبود دنیا — دیدی و باز رفتی
افگندہ سازِ ہستی — نغمہ نواز رفتی

صف بستگاں بہ گریہ
بعد از نماز رفتی

بہارِ خزاں گزیدہ

بنام خدائے سخن آفریں — گل و رنگ و بوے چمن آفریں
بمیدان محکم کند کوہسار — ز کہسار برپا کند آبشار
بہ کہسار سایہ کند آسماں — بداماں مہ و مہر و سیارگاں
درونش چہ خروارِ لعل و عقیق — برونش بہ ابر آشنا و رفیق
مزین بہ اشجارِ یاقوت رنگ — بپوشند اشجار زنگیِ سنگ
زمیں ہم ز اشجار رونق پذیر — ثمرہا بیارند آنہا کثیر
زمیں زر بیارد ز پہنائے کِشت — بحکمِ خدا کِشت گشتہ بہشت
بمردانِ پُر عزم آباد شد — پرِکاہ بالید و شمشاد شد
خدائے شب و روز و شام و سحر — بہار و خزاں باغ و اشجار و بر
بہار و خزاں را کسانے کہ دید — ہمہ تلخ و شرینِ دوراں چشید
بہاراں بداند گلستاں فروش — خزاں را بداند نیستاں بدوش
بہاراں چو آید ببارد گہر — شجر ہم بیارد ثمرہا نذر
فرستندۂ خاتم الانبیا — فرستاد با نسخۂ کیمیا
زنقشِ کفِ پا منور جہاں — ہر اک ذرۂ گردِ پا کہکشاں

جبینِ نیازم بہ آنجا نہم — مجلی شود تادلم در تنم
دریں خوش خرامی زمانہ گزشت — کہ تقدیرِ ما بابِ تازہ نوشت
خدائے مسبب وَ اسباب ساز — فرستندۂ خوب عشوہ طراز
فرستاد روزے یکے خوب رو — ستائش کننداں بہر کاخ و کو
فرود آمدہ آں خجستہ نژاد — خجستہ قدوم و خجستہ نہاد
سیادت چو ہمدوش ہم آمدش — سعادت قدم با قدم آمدش
ز بنیان اسلاف و آبا نجیب — ہمہ اقربا و اعزہ مجیب
نہ تخت و نہ تاجِ شہاں داشتے — ہمہ کس چو فردوسِ جاں داشتے
خراماں خراماں بگرد آمدند — بکشتِ تمنا ثمر کاشتند
فروغِ نظر شد فروغِ نگار — دعائے بزرگاں بروشد نثار
مثالِ بہاراں بگلشن وزید — چو بوئے گلِ تر بہر سو رمید
گلِ آشنائی چمن در چمن — بوئے دلربائی چو مشکِ ختن
چہ صبحِ تماشا در و بام کرد — منور مثالِ سحر، شام کرد
سخن گستری مثلِ قند و نَبات — تکلم چو آید ز خسرو بِنات
ہوائے مسرت ثمر بار شد — بہ مہرش ہمہ مَرز گلزار شد
چنیں بود آرائشِ انجمن — بہار و چراغاں ندیدہ چمن
خیاباں خیاباں قدم با قدم — سرائید نغمہ ہوا دم بدم
خموشی چو غنچہ دہن داد یافت — تکلم چو اوراقِ گلہا شکافت
خوش آمد چمن را ورودِ نگار — نگارِ چمن گشتہ بر وے نثار
شبِ مہ بدامان سیارگاں — شبِ تار سازندۂ کہکشاں
ندیدہ کسے ایں چنیں جا پناہ — کہ لطفِ فراواں بچشمش براہ

بہ تحسین ہر کس بہ گرد آمدش　　گلِ ہمنوائی بر افشاندش
ستودند اوصاف چو خسروی　　چو اشعارِ شہ نامہ و مثنوی
تلطف فراواں بطفلاں کشید　　ہماں طور پندِ بزرگاں شنید
تب و تابِ دوراں تفاوت نہ کرد　　شب و روز شاداں چہ گرما چہ سرد
بہ ایں طور عرصہ درازش کشید　　گلِ تر بہ بستانِ او ہم دمید
بنائے جہانِ نویں دادیافت　　بہرگوشہ یک نوعِ نایاب ساخت
ہوائے طرب دامنِ دل کشید　　طرب آشنا سوے دیگر ندید
زگرمیِ الفت دلم چوں گداخت　　اسیرِ چنیں شد رہائی نخواست
بیک جام خوردیم نوشین ما　　بہرگام آمد ہما رہنما
نشستیم و گفتیم ورفتیم ما　　مہ و سال در سلک سفیتم ما
بہ ہر جا رسیدیم باہم دگر　　گزشتیم باہم زِ ہَر بام و در
ہوائے مسرت بہر سو وزید　　نوید شگفتن بہر گل رسید
زمانہ بہر طور شاداں گزشت　　شب و روز یکساں، نہ بالا نہ پست
ولے جوششِ کار پایاں نداشت　　سعادت ہمانگہ نہ تنہا گزاشت
اشارت ز اطراف و اکناف دید　　بشارت برائے رفاقت رسید
چوں ارزش بہ شہرِ شہیراں رسید　　خوش آمد وَ گفتند خوش آمدید
بیا وَ بآرا است شہرِ قدیم　　کہ در علم و دانش مثالش عدیم
ہماں شہر افرنگ تاسیس کرد　　بہ نغمات تاغور[۱] تقدیس کرد
صحافت دراں شہر چشمش کشود　　خطابت بہ آزاد[۲] کردے نمود

---

(۱) رابندر ناتھ ٹیگور

(۲) مولانا ابوالکلام آزاد

چناں پہن چادر صحافت کشاد ‏— گرفتیم گوشہ وَ بردیم شاد
گراں بار بر دوشِ ماداشتیم ‏— ہماں را بہم نیز برداشتیم
کسانے کہ رختش دریںجا کشود ‏— تمامی تردد بگفتا درود
کمندِ اسیری بہ نو وارداں ‏— خوش آمد، نہ مانندِ قیدِ گراں
گرفتارِ زلفش رہائی نخواست ‏— بجا بود دی روز امشب بجاست
دراں شہرِ پہنا چو چرخِ کبود ‏— نگہدار و نگراں زِ چشم حسود
بہ لطفِ فراواں زمانہ چوں رفت ‏— یکے شد ہویدا نویدے بدست
طلبگارِ ما بود شہرِ دگر ‏— زما خواست بندیم رختِ سفر
ہماں شہرِ شاہانِ گردوں تبار ‏— ہمانجا گرفتے بزرگاں قرار
بزرگاں و شاہاں بہم آمدند ‏— بتدبیر و تعمیر پرداختند
بتدبیرِ ایشاں ریاست کشاد ‏— عناگیر گشتند فرخ نژاد
یکے تخت و تاجِ شہاں را گرفت ‏— دگر خانقہ ساخت و آنجانشست
قطب، تاج و آثار گردوں تبار ‏— قلعہاے سنگیں، مساجد، مزار
بہ اینجا بحکمِ خدا آمدیم ‏— بشارت بہر طور پنداشتیم
گرفتیم اینجا مصمم قیام ‏— دعاے دلی خواست عیشِ دوام
خوش آمد چو مارا ہواے چمن ‏— بہ سیر و تماشاے گنگ و جمن
قدم بوسِ ماشد فروغ و فراغ ‏— سوے آسماں جست کردہ دماغ
بہ طرحِ نویں یک جہاں ساختیم ‏— بہ سیرِ جہاں نیز پرداختیم
جہاں آشنائی گرفتیم ما ‏— بیک تار ہر شہر سفتیم ما
بجاے کہ رفتیم دانشوراں ‏— بگرد آمدے دوستاں مہرباں
پے ما یکے بود خانہ نشیں ‏— بہ گردش عزیزانِ ما ہمنشیں

ہمہ روز عیدے بہ کیف و طرب — تمنا، تماشا ہمہ وقتِ شب
کے آمد بایں طور نصف النہار — مہ و سال بودے نہ اندر شمار
زمانہ ولے خوش خراماں ندید — اگر دید در عیش داماں کشید
رُخش مہرِ تاباں بہ مغرب خمید — شبِ تار دامانِ روشن ورید
نسیمِ سحر دامنش چوں کشید — سوے باغ مُرغک مکرر ندید
سموم آمد و خار و خس کرد باغ — خیابان و گلزار گشتہ چو راغ
ندانم کجا رفت عشوہ طراز — ندانم کجا رفت افگندہ ساز
دگر بار سوے شبستاں ندید — شبستانِ ویران دم در کشید
نہ شمعِ شبستان نہ پروانۂ — نہ رقصِ پرستارِ دیوانۂ
بہارِ چمن راہِ دیگر گرفت — خزاں کرد ویران بستان و کشت
ہمہ روزِ روشن شبِ تار شد — نیستان بستان و گلزار شد
تمناے پیروز در دل فشرد — نہ پرّید مرغِ دعاہا، بمرد
ہواے چمن گشتہ چوں نوحہ خواں — عزا خواں عنادل بہ حال چناں
غزل شیوۂ نازنیناں گزاشت — غزلخواں حزیں تابِ ہجراں نداشت
غزلخوانیِ شاعرِ خوشنوا — نبود انچہ بودے بجائش بجا
دلِ ریش بے دارو و داد گر — بروں ریختہ جوے خونِ جگر
جہانِ سخن ہم برو تارشد — چو دل رفت از دست، نا دار شد
ثمرہا نہ اشجار بستاں نہ کشت — بتنگ آمد و راہِ صحرا گرفت

کسے بارِ دیگر ہماں را ندید
زمانہ بنامش قلم درکشید

حکایتِ صحرانورد

چناں بود تقدیر آں شاہباز کہ ابنائے دنیا بسا زند باز
بحکمِ خدا راہ بستہ کشاد وَ صحرا نوردے بصحرا نماند
حکایت چنیں است یکے لا جواب حقیقت چنیں است گوئی کہ خواب
یکے ناگہاں سوئے صحرا چوں رفت چناں شور برپا بصحرا و دشت
ندیدہ کسے آنچناں در چمن نہ در شاہراہے نہ در انجمن
سکوت آشنائے ہمآنجا نشست بزیر درختے پناہے گرفت
تفکر بہ انواع آواز کرد ہر اک مختلف بود ہم فرد فرد
ولے لہجہ چوں نوحہ خواں داشتند نہ چوں بلبلاں نغز خواں داشتند
خروشِ عنادل چوں در دشت زاغ بہ شیر و شغالاں پراگندہ راغ
غزالانِ صحرا گریزاں زِ رم سکون آشنا یاں چوں صیدِ حرم
تفکر گرفت دامنِ نیک مرد گہے آبدیدہ گہے آہِ سرد
بہ بحر تفکر گہے غوطہ زن گہے خاک برسر خراشیدتن
درِ یادِ ماضی یکایک کشاد بہ جا بود شاعر ہماں کم سواد
زِ خود رفتہ ماندہ بحالِ خراب خموشی بہ لب اندروں اضطراب
نہ رخشندہ چشمش مثالِ سراب نہ رودے زِ اشکش نہ حوضِ پر آب
نہفتہ حکایت دراں چشمِ باز خموشی بہ لب نیز غمازِ راز

تواں خواند مردے بہ روشن ضمیر
بدانش فراواں تدبر کثیر

چوں تاکِ محبت شکست در چمن
سخنور شکست رشتۂ انجمن

چوں در سوق و بازار الفت نیافت
بسوئے بیابان و صحرا شتافت

محبت چنیں سحرِ پُرکار است
بیابان و صحرا چوں گلزار است

بہ دامِ محبت گرفتار شد
بہ صحرا مکیناں سروکار شد

وحوش و طیور ہم شناسا شدند
ہراساں نبودند نزد آمدند

نہ فہمید غوغائے ہمسائگاں
اشاراتِ الفت نہ شد رائیگاں

ولے ایں چنیں ماجرائے چرا
سخنور بصحرا سرائے چرا

گسستے چرا رشتہ از شہر و باغ
گرفتے چرا راہِ صحرا و راغ

دلش چوں زِ ابنائے دنیا شکست
بناکرد رشتہ بہ انواعِ دشت

چوں خواہی کہ دنیا توانا شود
بنی نوعِ انسان دانا شود

ہمہ کس بہ ہر کس بباید بکار
توانا کسے را نداند نزار

نہ دشمن شمارد کسے را کسے
تقرب بدارد کسے با کسے

محبت کنی گر بہ مخلوق واللہ
محبت کنی تو یقیناً بہ اللہ

محبت بہ مخلوق حکمِ خدا ہست
محبت بہ ہر طور ردِ بلا ہست

بہ ایں فکر ہر دو مراجع شدند
خراماں خراماں بہ شہر آمدند

بکارِ جہاں باز پرداختند
محبت بہ انساں بِنا ساختند

حقیقت بہ شاعر شد ہم آشکار
خزاں گر گزیدے نہ یابی بہار

نہ باز آید آبِ رواں چوں بہار
نہ بر کوہ راجع شود آبشار

حیات اک دوام است چوں جوئبار
رواں است ہر دم ندارد قرار

محبت چیست

محبت یکے حسنِ محجوب است   نہ بیند کسے گرچہ مطلوب است
محبت نہ چیزے کہ بیند کسے   نہ چیزے کہ در دست گیرد کسے
چہ خوشبو کہ پوید بہ روح و رواں   چہ نغمہ کہ پیراں کند نوجواں
مسرت کہ صوفی بجاں پرورد   قلندر بہ خرقہ نہفتہ برد
بصیرت درونی چوں داری ببیں   تو محجوب داری قریں ہم نشیں
صدف قطرۂ آب گوہر کند   بہ الفت بہ آغوشِ خود پرورد
غزالے بوئے مشک بخشد لہو را   چوں نے نغمہا کرد سوزِ گلورا
محبت چوں نیساں، ببارد گہر   شجرہا بیارند بر شاخ بر
محبت کند ناتواں را تواں   زِ انوارِ الفت منور جہاں
زمیں می برد بارِ کوہِ گراں   فلک می کشد بارِ سیارگاں
کشش انچہ دارد بجا کہکشاں   نشانِ محبت ہمآں را بداں
محبت عصائے بہ ہر بے بصر   کند کار ہر گہ چوں روشن نظر
برائے زباں، لعل باشد اگر   محبت بہ دستش زبانِ دگر
محبت بہ لنگے چوں پائے دگر   گہے دست گیرو سرِ رہگرر

دلِ آشنا اک جہان محبت — تپیدن بہ آتش نشانِ محبت
چوں احساس قالب کند اختیار — محبت بہ عالم شود آشکار
محبت جوئے شیر برپا کند — گہے سنگ را راہِ دریا کند
محبت کند شعلہ را بوستانے — گلو زیرِ خنجر محبت نشانے
محبت کند سنگ را تاجِ بیچوں — کشادہ کند راہ در بحر و گردوں
بیا اک بنائے محبت گزاریم — ہر اک نا کسے را کسا نے شماریم
ولے مشکل است در جہانِ دو رنگ — یکے مثلِ موم است دگر مثلِ سنگ
چوں فقدانِ الفت بصحرا براند — بہ گلزارِ الفت و گربار خواند

■❖■

جہانِ دو رنگ

گیا ہے لبِ آبرو دے نمود		بہ دنیائے ہم رنگ چشمش کشود
زمانہ بہر طور آنجا گزشت		پرِ کاہ گردید بالا درخت
محبت بہ آبِ رواں پرورد		جہانے بہ ایں طور بر می خورد
جہانست یک پیکرِ خیر و شر		زمانہ رَخش کرد سوئے دگر
نبودے چوں بودند ہمسائگاں		تلتف میانش چوں شد رائگاں
خراشید آنجا ز میں بے گماں		تراشیدبن بیخ آبِ رواں
شجر برگ افشاند شد بے لباس		پرنداں گریزاں نبودند پاس
یکا یک بروزے فتادے بر آب		فرو وبرد موجے بحالِ خراب
چنیں است دو رنگِ دنیائے دوں		یکے رنگ ظاہر دگر اندروں
نشاید بہ دنیائے دوں جانسپاری		نباید برو روز و شبہا گزاری
دریں حالِ دنیا کجا راہ و رہبر		کہ از حالِ ابتر کند حال بہتر
ببیں اندروں تا تو یابی جواب		تو یابی جوابے بہ ام الکتاب
احادیث خیر الامم ہم ببیں		کہ یابی سکونِ ولی بالیقیں

■❖■

قطعاتِ کتب

چو سیرِ گلستاں بہ پایاں رسید
ثمر ہائے کشتم بہ داماں رسید
بتوفیقِ و تائیدِ پروردگار
بہ اوراق احوالِ رضواںؔ رسید

☆☆

بسرم گزشت بگوئمت چہ خجستہ بود دیارما
ہمہ کشتِ زر ہمہ باثمر کہ خزاں ندیدہ بہارما
نہ بہشت بود بریں زمیں ولے ما فدا وفریفتہ
ہمہ تلخ و ترشِ زمانہ ہم نتواں شکست خمارما

☆☆

قلم چوں بہ قرطاس تیشہ زند
جہانِ نہفتہ درو برکند
ز ترسیلِ اخبار عالم تمام
چو مہرِ درخشاں مجلّا کند

☆☆

حقا کہ ایں ضعیف نہ تابِ کلام داشت
ایں ہم عطائے اوست نوائے دوام یافت

از بہر ہم نوائی بسوئے قلم شتافت
قرطاس را برائے قلمرو نگاہ داشت

دُر ہائے شاہوار دراں مَرغزار کاشت
نو طرزِ بوستانے کہ رضوانؔ میاں گزاشت

☆☆

دیہہ و دہقان پاستانِ مرا
روم و شیراز و اصفہانِ مرا
کشتِ گندم و انبہ بر اشجار
زعفراں زار و بوستانِ مرا

☆☆

ما چراغ ہستیم و پروانہ خودیم
طرفہ خود آگاہ و دیوانہ خودیم
پاسدارِ آبروئے دردِ خویش
ما صدف ہستیم و دُردانہ خودیم

☆☆

شگوفہ ہائے قلم زاد انچہ پیشم است
چوں لختہائے دلِ ریشِ خویشم است
چہ بارِ یادِ شناسائیہاں گویم
کمر خمیدہ برم من بدوشم است

☆☆

بادا کہ ہر ورق ورقِ گلستاں شود
بادا کہ ایں حدیقۂ فن جاوداں شود
بادا کہ در سوادِ مزین ز مہر و ماہ
زنجیرۂ نگارِ سخن کہکشاں شود

☆☆

ندا آمد کتابی را نگار و نقشِ ثانی کن
بآرا حرف و لفظ و جملہ گلزار معانی کن
اودھ را قند فارس نذر کردن چوں بنا کردی
کتابِ جاودانی کن قلم را کلکِ مانی کن

☆☆

کشف محجوب شیخ ہجویری
صوفیا را نصاب تحریری
نقش بر دل شدہ نوای سروش
بارک اللہ خوش تدابیری

☆☆

چون می دارم جهان اندر جهانی
نہ پندارم کسان و ناکسانی
رموز زندگی آموخت پیری
جوانمردی نداند در زمانی

☆☆

داستان دل بگو سعی لا حاصل بگو
مُزد محنت کش برید برملا قاتل بگو
راست گوئی پیش آر برسر محفل بگو
خوگر طوفان شو ورطہ را ساحل بگو

☆☆

زھی دردت کہ بایک عالم آشوب جگر خوابی
دود در دل گدایان را و در سر پادشاہان را
بہ حرفی حلقہ در گوش افگنی آزاد مردان را
بہ خوابی مغز در شور آوری بالین پناھان را

☆☆

گنجینہ ھندی گویا قند مکرر گو
شیراز و صفاہان را نذرانہ گوہر گو
گردوں ادب فارس اقصائے فلک ھندی
سازندۂ اقصا را مہر و مہ و اختر گو

☆☆

برخی اندوختہ کتابی گشت
ذرہ ذرہ جو آفتابی گشت
آنچہ اندوختم بفضل خدا
گوھر ناب و لا جوابی گشت
☆☆

سحر دمید بیا بام و در کشادہ کنیم
بیا کہ قصہٗ فصل بہار تازہ کنیم
بیا کہ خوشئہ دل جام ارغواں پُر کرد
بیا بیا کہ بہم باز شغل بادہ کنیم
☆☆

متفرقات

گلہا ز خونِ دل سرِ داماں شگفتہ ام
از بہرِ آں گلے رہِ گلزار رُفتہ ام
تا آنکہ اخترے ز سپہرِ شبے نماند
خوابِ خوشم ز دیدۂ خونبار شُستہ ام
دانند آنچناں کہ غمِ دوست می خورم
امّا بہ پہلوم غمِ فردا نہفتہ ام
باید نگاہ تابہ رخِ یار ہم رسد
در ہائے شاہوار دریں تار سُفتہ ام
وا ماندہ ام کہ قسمتِ من دیدنش نبود
ہر برگِ گل بدامنِ گلزار جستہ ام
ایں ہم شریکِ حالِ شبِ ہجرِ من نشد
یک شمعِ جانگداز سرِ شام کُشتہ ام
سودے ز گفتنش نشود ما جرا ولے
تابے نبود حالِ دلِ زار گفتہ ام
رضوانؔ کسے ندید جہانم چہ طور سوخت
بارید چشم زانکہ دل و جان تفتہ ام

○

آرے صنم ندیدی؟ خوابِ خوشم ندیدی؟
تاک و سحاب و صحبش باغِ ارم ندیدی؟
صہبا بہ آبگینہ چشمش بہ نم ندیدی؟
بسمل ز شوق دیدن صد بار ہم ندیدی؟
برقِ نگہ چہ کردست خاک و خسم ندیدی؟
سوزِ دوام بخشد نظرِ کرم ندیدی؟
صبحِ دعا کجائی؟ شام الم ندیدی؟
حیراں کہ کس نہ پرسد صیدِ حرم ندیدی؟
کیف و فراغ دیدی پہنائے غم ندیدی؟
رضوآں بہ شیب و شامے
سیرِ قلم ندیدی؟

■❖■

○

بیا روانیِ صہبا بچشمِ تر باقیست
شدست شام چساں آمدِ سحر باقیست
چناں ربود مرا آرزوئے خوش نگری
بسے بریم و تمنائے خوب تر باقیست
گداز و سوزِ وجودم ز آتش پنہانست
ہمہ بسوخت ولے جستۂ شرر باقیست
شباں گہے بہ نگاہم ضیائے خورشیدے
بہ طبعِ روشنِ من جلوۂ سحر باقیست
ہوائے تیز گسستست تارو پودِ حیات
فضائے تیرہ، نفس تیز و رہگذر باقیست
بنائے امن و مساوات خوابِ خوش رضواںؔ
کہ درمیانِ جہاں رزمِ خیر و شر باقیست

■❖■

O

سن صوت و صدا پیدا فریاد و فغاں پنہاں
یا طرزِ نویں پیدا یا درد بجاں پنہاں
ایں رنگِ گل و لالہ از خونِ جگر پیدا
در شعر و کلامِ من یک طبعِ رواں پنہاں
حیران و پریشانم یاری شدہ گم گشتہ
گلگشتِ جہاں پیدا تزویرِ کماں پنہاں
دنیا تہِ دام آمد تقدیرِ امم نالد
ادیان و ملل گشتہ اسباب زیاں پنہاں
خندیدم و برجستم گوئی کہ گل افشاندم
ہر درد کہ بخشیدند بردیم بجاں پنہاں
چیزے کہ بروں جستہ از چشم غزال آسا
پیوستہ ہمی پوید در روح و رواں پنہاں
بیدار ہمی بینی خامیست جہاں رضواںؔ
آثار ہنر پیدا در خوابِ گراں پنہاں

■❖■

O

''ما از پئے سنائی و عطار آمدیم''
در جستجوئے گلشنِ بے خار آمدیم

رفتیم سوئے دشت بسودائے بے سری
اما بسوئے شہر چہ ہشیار آمدیم

یک برگِ گل ز راہِ تلطف برائے ما
اے شاہدِ حیات بدیدار آمدیم

اے دشتِ عمر طور مجلیٰ بشو کہ ما
یک ذرہ سوئے مطلع انوار آمدیم

اے تیرگی وداع کہ پیروزیِ سحر
برکف نہادہ طالعِ بیدار آمدیم

برخیز! دست آر! کہ بنیانِ نو نہیم
نے ما برائے شورش و پیکار آمدیم

جستیم از کمندِ فنا گوئے تا بریم
ہر گاہ باز صورتِ پرکار آمدیم

رضوانؔ زندہ دار کہ چوں قصۂ بہار
صد بار رفتہ ایم و صد بار آمدیم

■❖■

O

چوں نہ بینی دردِ پنہاں چشم و دامانم نگر
داغہا در سینہ دارم زخمِ عریانم نگر
درد و داغ و زخم و اشک و ناکسی و پیچ و تاب
منزلم خود آگہی پیشم و سامانم نگر
قصۂ ما مشعلے روشن کند راہِ صواب
شعلہ سامانم ولے گلہا بدامانم نگر
آہ بوئے ہمنوائی ہم درونِ چاہ شد
ہمنوا یاں گم بدشت و راغِ کنعانم نگر
دیدنی باشد تماشا کے ترازو می کشد
رحمتِ والائے شاں یا بارِ عصیانم نگر

■❖■

اے دل بگوچہ دردے داری؟ اے درد بگوچہ شکلے داری؟
اے دردِ مرا بمن بگوئے جُز من کجا تو اصلے داری؟

....

دردِ من تراچہ رنگِ قشنگ سبزۂ من چرا کردۂ زنگ
دردِ من بیں برائے خدا صبر برمن چوں کردہ دامن تنگ

■❖■

○

دعای خیر می گویم پس تمہید طولانی
نگاہم را مجلیٰ کن ز نور قبلہ ثانی
ہما نوری کہ می بارد ز قوس شبنمستانی
برای کحل چشمانم عطا کن خاکِ لاثانی
ہمان خاکی کہ پا بوس نبی دین لافانی
بسی بردی میاں رضواںؔ
بشکند بندِ طغیانی

■❖■

گفتا کہ ایں دکان کتاب و قلم بس است
گفتم کسی نداد دکان چنین زدست
گفتا دکان خالی ز فکر و سخن حدِ سود
گفتم کہ این دکان ز مردان خود برست

■❖■

غنچه

گلهای نا شگفته — یعنی جمال خفته
دزدی چنین که گوئی — خوشبو ز خود نهفته
از بس دو لفظ می گو — یعنی کمال غنچه
یا رب چه کار آید — سفتن برای سبحه
انجام کار دیده — شبنم چنین بگریه
بکشا بپاش خوشبو — یابی نه وقت رفته
چشمی کشاو و بنگر — افگنده خواب و نشه
قبل از که باد صرصر — بینی به دل گرفته
آری چه کار دارند — خدامِ دست بسته

■❖■

گفتا که تبصرات کتب هم کتاب هست
گفتم ولی این ناقد خوب وخراب هست
گفتا که این کتاب مثال دگر کتب
گفتم ولی میان کتب انتخاب هست

■❖■

O

شدی آن دمی کہ صبا رسد — بہ بہار بوی وفا رسد
سر صبح دست حنا رسد — سر شام زلف دوتا رسد
چہ شگفت غنچہ وا نشد — نہ گل و سمن بہ بہارسد؟
نہ کشادہ دامن آرزو — بہ قفائ تیر قضا رسد؟
شب تار اشک سحر ببین — دل خون شدہ بہ بہارسد
گہی شہ سواری و برتری — گہی شر بہ کوئے گدا رسد
سر خود شکستہ و سرخ رو — دری وانشد نہ صدا رسد
دُر شاہوار حذف شدہ — ز فراز فرق بہ پارسد
ای خدا کا ست قاہری — بہ درم ہجوم بلا رسد

چہ تہلکہ بہ جناب آں
چون دعا بہ ربِ علا رسد

■❖■

گردش دوراں کسی شاداں ندید
فارغ گردش کسی دوراں ندید
رفتنش یک زخم کاری بودھم
وقت رفتن سوئے ما جانان ندید

■❖■

چرا دیوانہ درد آشنا دیوانہ تر گردد
چرا باکاسۂ الفت شناسا در بدر گردد
بہاراں یک قبای نو براے گلستاں آرد
خزاں چون دشمن گلباری شاخ و ثمر گردد
ہمان مردود نابینا صدف گوہر کجا یابی
کہ محجوب حجاب پارسا داماں تر گردد
خدا آگاہ گردد گر کسی بعد از خود آگاہی
جہان رنگ و رامش در نگاہش ہیچ تر گردد

■❖■

چو شیب ما بدامانش عذاب بی مہار آمد
صبا غمگین فضا غمگین بہاراں اشکبار آمد
شباب شاخ برگ افشاں شجر سایہ نمی دارد
گریباں چاک گل گشتہ گرفتہ دل ہزار آمد
شب غمہاے دل ریشم ز چشمم خواب می نجوید
گہی دیوانہ دل رقصد، نگار آمد، نگار آمد
گہی در خواب بر خیزم خروشم گوئی دیوانہ
ببیں یاراں ببیں یاراں نگار گلعذار آمد
تمنای گل خوشتر نہفتہ در دلم رضواںؔ
خزاں دیدہ بہارم گشت و دامانم بخار آمد

■❖■

دلم بخواست کہ احوال پاستان گویم
کجاست تابِ شنیدن کہ داستان گویم
قلم زجیب برآمد بخون آغشتہ
کہ درد و داغِ جدائیِ همرهان گویم
☆☆

چہ کنم بگو چون دل ریزد
قطرہ قطرہ بہ اشک هم بیزد
کشتی عمر را بہ ورطہ فتاد
این چہ طوفان اندرون خیزد
☆☆

داستان شہر خوبان فکرِ من مھمیز کرد
نغز گویی صیقلِ طرزِ بیان را تیز کرد
حرف چون خالِ رخِ قرطاس بیضا در شهود
لفظ چون اوراق گل تحریر را گل بیز کرد
☆☆

چہ روی خوب روی تو
چہ بوی مشک بوی تو
دلم گداخت شمع گون
بہ یاد و آرزوی تو

☆☆

چہ می کنم کہ خوردمی
شراب از صبوی تو
بہ بین کہ مثل مرغ باد
دلم شدہ بسوی تو

☆☆

آشوبی کہ ھر فرد ازو می لرزد
جولائی توان گفت دسمبر نتوان گفت
احوالِ دگرگون شدہ زنھار مپرس
با شعلہ توان گفت بہ اخگر نتوان گفت
آن ورد کہ داریم نہ پیداست نہ پنھان
باخویش توان گفت بہ دیگر نتوان گفت
افتاد چنانست بجز اشک نہ یابی
این مایہ چنانست بہ دلبر نتوان گفت
گفتم کہ بگو حال گلستان و شبستان
گفتا کہ بہ رضوان معمر نتوان گفت

☆☆

به یادِ مادر

کسی که ناز مرا میکشید، مادر بود
کسی که حرف مرا می شنید، مادر بود
کسی که گنج به دستم سپرد، بود پدر
کسی که رنج به پایم کشید مادر بود
کسی که شیره جان می مکید، من بودم
کسی که روح به تن میدمید، مادر بود
کسی که در دل شب از صدای گریہ من
سپند وار ز جا می جهید، مادر بود
کسی که خاری اگر پیش پای من میدید
چو غنچه جامه به تن میدرید، مادر بود
کسی که اگر دور میشدم ز دامانش
برہنه پا، ز پیم میدوید مادر بود

کنار بسر بیماریم پرستاری
کہ تابہ صبح نمی آرمید، مادر بود
بہ روز گار جوانی کسی کہ قامت او
بہ زیر بار محبت خمید، مادر بود
کسی کہ در غم و اندوہ و در پریشانی
بہ دردھای دلم می رسید مادر بود
غرض کسی کہ ز دنیا و آرزوہایش
برای خاطر من دل برید مادر بود
یکی شکستہ قفس ماند و خستہ مرغی زار
کہ ز اثری بہ ثریا پرید، مادر بود

■❖■

بیادِ محبِ محترم

مولانا ابومسعود اظہر ندوی مرحوم

مردِ کامل از جہاں دامن کشود
سوگوار از رفتنش بزمِ شہود
آمد و چندے نشست و بازگشت
مرگ اورا از میانِ ما ربود
تیز رو کردست کارے باشتاب
مختصر کردست فصلِ ہست و بود
کاوشِ قلمش کتب بسیار داد
عالمِ دیں، ماندۂ کاوش، غنود
عقل روشن از وفورِ علم دیں
قلب روشن تزر تکثیرِ سجود
رحمتِ رحمٰں برو بادا دوام
علم دیں از کاوش اظہر فزود
"**خفت عارف**" سال ہجری بودہ است
بے نیازِ عالَمِ سودا و سود

۱۴۳۱ھ

■❖■